افکارِ سلیم

مرتبہ

محمد اسماعیل پانی پتی

(سلسلۂ اشاعت حالی اکیڈمی نمبر ۱)

(جملہ حقوق محفوظ)

افکارِ سلیم

یعنی

مجموعۂ کلام ابوالمحاسن مولوی سید وحید الدین سلیم مرحوم پانی پتی

لٹریری اسسٹنٹ سرسید و پروفیسر ادب اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

مرتبہ

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ایڈیٹر اخبار "پیغام حیات"

شائع کردہ

حالی اکیڈمی پانی پت

۱۳۵۷ھ

۱۹۳۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش نامہ

مولانا وحید الدین سلیم کے کلام کو جمع کرنے کا خیال مجھے اُن کی زندگی ہی میں پیدا ہو گیا تھا، اور ایک مرتبہ جب وہ حیدر آباد سے وطن آئے تو میں نے اُن سے اس کا تذکرہ بھی کیا تھا۔ مگر ارادہ عمل کی شکل اختیار نہ کرنے پایا تھا کہ ملیح آباد سے مولانا کے انتقال کی افسوسناک خبر آئی۔ اور کام بیچ کا بیچ میں رہ گیا۔

جو ذرائع اُن کی زندگی میں اُن کا کلام جمع کرنے کے حاصل تھے اُن کا حصول اب ناممکن تھا۔ ناچار میں نے اخبارات کے پرانے فائلوں اور ماہوار رسائل کی قدیم جلدوں کی تلاش شروع کی۔ اور جہاں سے جو کچھ ملا اُسے جمع کرتا رہا۔ بعض نظموں کے مجموعوں سے بھی مجھے مدد ملی۔ جن میں مولانا کی بعض نظمیں نقل کی گئی تھیں۔ اُن کے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کی زبانی جو کچھ مل سکا وہ بھی محفوظ کر لیا۔ غرض سالہا سال تک اس کے لئے لائبریریوں کی چھان بین، قدیم اخبارات و رسائل کی ورق گردانی۔ اور

لوگوں کی خوشامد درآمد کیا کرتا رہا۔ تب جا کر اس قابل ہوا کہ اپنی مسلسل جستجو کے نتیجہ کو اربابِ ذوق کی خدمت میں پیش کرسکوں۔

سلیم ابھی بہت چھوٹے بچے تھے اور مکتب میں قرآن شریف پڑھتے تھے، کہ انھیں شاعری کا شوق پیدا ہوگیا۔ سلیم کی شاعری کی ابتدا کس طرح ہوئی؟ یہ ایک بہت ہی پُر لطف داستان ہے جو پھر کسی وقت بیان ہوگی۔ مختصر یہ کہ عُمر اور لیاقت کے ساتھ شاعری کا شوق ترقی کرتا رہا۔ اور چودہ برس کی عُمر میں جو پُرزور فارسی قصیدہ اُنھوں نے اپنے پیر کی شان میں تصنیف کیا، اُسے دیکھ کر بڑے بڑے فارسی داں حیران رہ گئے۔ مولانا اُس زمانہ میں مفتوں تخلص کرتے اور نہایت ذوق وشوق کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کرتے اور داد وتحسین لیتے تھے۔ خود بھی بچوں کے مشاعرے قائم کرتے، اور اُن میں اپنی غزلیں خوب لہک لہک کر پڑھتے، اور خود ہی لُطف اُٹھاتے تھے۔ اس زمانہ میں یا تو قدیم طرز کی عشقیہ غزلیں تصنیف کرتے، یا مذہبی نظمیں لکھتے تھے۔ اُس زمانہ کا نعتیہ کلام ان کا مِلا ہے۔ جو عنقریب ہدیہ ناظرین ہوگا۔

نوجوانی ہی کے ایام میں سعدیِ ہند حضرت شمس العلماء مولانا حالی کی صحبت نصیب ہوئی۔ جس نے اُن کی شاعری کی کایا پلٹ دی۔ اب مفتون کا تخلص سلیم تھا۔

قدرت نے سلیم کو جیسا آزاد دماغ دیا تھا، دل بھی ویسا ہی لاابالی بنایا تھا سینکڑوں نہیں ہزاروں غزلیں لوگوں کو بنا کر دیتے جو وہ اپنے نام سے مُشاعروں میں پڑھ کر داد لیتے صدہا نظمیں لکھتے، اپنے دوستوں کو سُناتے اور ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے۔ لمبی لمبی

مثنویاں فی البدیہہ تصنیف کرتے، اور انھیں قلمبند نہ کرتے۔ رسالوں اور اخباروں میں اپنی نظمیں چھپواتے تو یا تو کوئی فرضی نام یا "ایم۔ آئی" اور "ڈبلیو۔ ایس" وغیرہ حروف نظم کے نیچے لکھ دیتے۔ غرض اپنا نام ظاہر نہ کرتے۔ جب کبھی اُن سے کوئی شخص کہتا کہ اپنے کلام کو محفوظ رکھیں تو وہ ہمیشہ یہی جواب دیا کرتے کہ "میں تو تختی پر لکھتا ہوں۔ لکھتا ہوں اور مٹا دیتا ہوں" بغرض نہ اپنا کلام جمع کرتے۔ نہ اُسے محفوظ رکھتے نہ اپنے نام سے چھپواتے۔ نہ معلوم کتنی بیشمار نظمیں اس تغافل کی نذر ہوگئیں جنکا اب کوئی سراغ کہیں سے نہیں مل سکتا۔ عرصہ دراز تک اُن کا یہی شیوہ رہا حیدرآباد جانے کے بعد اسمیں تبدیلی پیدا ہوئی۔ اب وہ رسائل میں اپنا کلام اپنے نام سے چھپنے کے لئے بھیجنے بھی لگے، اور ایک کاپی بھی بنالی جسمیں اپنی نظمیں لکھتے رہتے تھے۔ افسوس موت نے مہلت نہ دی کہ اپنے کلام کو خود مرتب کر جاتے۔

جس آرزو کو مولوی سلیم اپنے ساتھ لے گئے، اُسکے پورا کرنے کا بیڑا اُنکے اپنے ہی وطن میں ایک شخص نے اٹھایا اور آج انکی نظموں کا یہ مجموعہ پانی پت سے شائع ہو رہا ہے۔ خدا حسن قبول روزی کرے اور اصحاب ذوق اِس سے پورا حظ اُٹھائیں۔ (آمین)

نظموں کی تلاش، اُن کی نقل اور مقابلہ کرنے میں مجھے برادرم شیخ رحیم الدین صاحب سے بیحد امداد ملی ہے اور میں اُن کی اس عنایت کا نہایت ممنون ہوں۔ اسی طرح اپنے لائق دوست مولوی محمد عظمت اللہ صاحب "مولوی فاضل" کا بھی جنھوں نے نہایت محنت اور توجہ سے بکمال مستعدی بہت ہی جلد اس مجموعہ کی کتابت فرمائی عزیزی شیخ محمد شجاع الدین صاحب شعلہ زبیری کا بھی میں نہایت شکر گذار ہوں کہ انھوں نے نہایت محنت کیساتھ کاپیوں کی تصحیح فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر تینوں احباب خلوص اور محبت کیساتھ میری امداد نہ فرماتے تو میں ایسا بیکار اور سست انسان ہوں کہ میرا یہ ارادہ شاید کبھی شرمندۂ عمل نہ ہو سکتا۔

مخدومی خواجہ سجاد حسین صاحب ریٹائرڈ انسپکٹر آف سکولز (خلف شمس العلماء مولانا حالی) محترمی شیخ محمد بدرالاسلام صاحب فضلی (منشی فاضل) بی۔اے۔بی۔ٹی (علیگ) سابق پروفیسر ٹوکیو یونیورسٹی جاپان۔اور مجی سید اشفاق حسین صاحب رمزی۔ایم۔اے بی۔ٹی (علیگ) کا بھی نہایت ممنون ہوں جنھوں نے مقدمہ کو سنکر اسمیں مفید ترمیمیں اور اصلاحیں فرمائیں۔ورنہ یقیناً اسمیں بہت سی خامیاں رہجاتیں۔مکرمی خواجہ امیر احمد صاحب بی۔اے۔سابق ایڈیٹر "عصر جدید" وائس پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی پانی پت، برادرم شیخ انوار الدین صاحب اور عزیزم شیخ محمد فاروق صاحب نے نظمیں بہم پہنچانے اور اُن کے جمع کرنے میں جو امداد فرمائی ہیں اُنکا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔اس سلسلہ میں مجھے سب سے بڑی امداد حکیم نور احمد صاحب گلچیں ایڈیٹر "آفتاب مشرق" کرنال سے ملی ہے۔جنھوں نے بلا تامل اپنی وہ کاپی جسمیں آپ اکتوبر ۱۹۲۸ء سے سلیم کا کلام جمع کر رہے تھے، میری درخواست پر مجھے مرحمت فرمادی۔ضمیمہ کی آخری متعدد نظمیں انہی کی عنایت کے نتیجہ میں شائع ہوسکی ہیں۔

میں لائبریرین صاحب جامعہ ملیہ لائبریری دہلی کا بھی بیحد شکرگذار ہوں کہ انھوں نے نہایت مہربانی کیساتھ لائبریری کے پرانے رسائل سے مجھے مولینا سلیم کی نظمیں نقل کرنے کی اجازت دی۔مجموعہ کی اکثر بہترین نظمیں مجھے وہیں سے دستیاب ہوئی ہیں۔آخر میں میں اُن تمام اخبارات ورسائل کے ایڈیٹر صاحبان کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں، جن سے میں نے نقل کرکے یہ مجموعہ تیار کیا ہے۔

میں نے حتی الامکان نظمیں تلاش کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔لیکن اگر اب بھی کسی صاحب کے پاس کوئی ایسی نظم مولینا سلیم کی ہو جو اس مجموعہ میں شامل نہ ہو تو براہِ کرم اُس کی نقل مجھے بھیجدیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں شائع ہوسکے۔

(خاکسار محمد اسماعیل پانی پتی)

۲۵ شعبان المکرم ۱۳۵۷ھ

مقدمہ

مولانا سلیم کی شاعری

مولوی سید وحیدالدین سلیم ماہرینِ اردو کے اُن چند مشاہیر میں سے تھے جن پر ہماری زبان اور لٹریچر کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔ جدید اصطلاحات کے وضع کرنے۔ نئے الفاظ کے بنانے اور زبان کی تحقیق کے لحاظ سے اردو کا کوئی بھی انشا پرداز سلیم کے مقابلہ میں نہیں کھڑا کیا جا سکتا۔

عجیب اتفاق ہے کہ وہ عالی مرتبہ انسان جس نے ہماری شاعری کی کایا پلٹ دی یعنی حالی اور وہ زبردست انشا پرداز جس نے اردو کے لئے سینکڑوں نئے لفظ اختراع کر ڈالے یعنی سلیم دونوں ہموطن اور ایک ہی شہر کے فرزند تھے۔ پانی پت کو فخر ہے کہ اس کی خاک سے دو ایسے جلیل القدر ادیب پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی خداداد قابلیتوں سے کام لیکر اردو نظم و نثر کو ایک نئے سانچہ میں ڈھالا۔ اردو زبان اپنے ان دونوں محسنوں کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی اُن کے نام اردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتے رہیں گے۔

یہ بھی ایک عجیب تطابق ہے کہ یہ دونوں نامور انشاپرداز نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ یعنی جیسی اُن کی نظم مؤثر۔ بلند پایہ اور دلفریب ہوتی تھی ویسی ہی نثر سلیس۔ عام فہم، اور پُرزور ہوتی تھی۔ حالانکہ یہ بات بہت کم انشاپردازوں کو میسّر آتی ہے۔ اور عام طور پر یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی کی نظم اچھی ہوتی تو نثر بے مزہ اور اگر نثر عمدہ ہوتی تو نظم پھیکی ۔ ... کم از کم یکساں قابلیت تو شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ مگر تسلیم میں ان دونوں خصوصیتوں کے علاوہ ایک اور وصف بھی بدرجۂ کمال تھا۔ یعنی بلند پایہ ادیب اور بے مثل شاعر ہونے کے ساتھ وہ ایک زبردست لکچرار بھی تھے۔ اورنگ آباد میں اُن کے ایک لکچر کی کیفیت مرزا فرحت اللہ بیگ نے اس طرح بیان کی ہے:-

"معلوم ہوتا تھا کہ شیر گرج رہا ہے۔ تقریباً دو ہزار آدمی کا مجمع تھا۔ مگر سناٹے کا یہ عالم تھا کہ سوئی گرے تو آواز سُن لو۔ لفظوں کی نشست۔ زبان کی روانی اور آواز کے اُتار چڑھاؤ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے جو اُمڈا چلا آرہا ہے۔ یا ایک برقی رَو ہے کہ جو کانوں سے گذر کر دل و دماغ پر اثر کر رہی ہے۔ برس روز ہو چکا ہے۔ مگر اب تک وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں نے بڑے بڑے لکچر دینے والوں کو سُنا ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا پُراثر لکچرار میری نظر سے نہیں گذرا۔"

تیسری مماثلت اِن دونوں میں یہ ہے کہ جس قسم کے باکمال، لائق اور قابل بزرگانِ قوم کی صحبت مولانا حالی کو میسّر آئی تھی، مولانا تسلیم کو بھی قریباً ویسی ہی صحبت نصیب ہوئی۔ اور اُنکی وسعتِ نظر کا ایک بڑا سبب بن گئی۔

حالی کی عظیم بالشان اور مقدس شخصیت اس وقت زیرِ بحث نہیں۔ ہمیں یہاں صرف تسلیم کے متعلق کچھ کہنا ہے:-

ص ۲۰ اردو مجلہ جون ۱۹۵۳ء

قدرت نے جہاں مولوی وحیدالدین میں بہت سی اور قابلیتیں ودیعت کی تھیں وہاں شاعری کے لئے بھی اُن کا دماغ نہایت موزوں بنایا تھا۔ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اُن کے دماغ سے اشعار نکلا کرتے تھے۔ اور پھر عامیانہ اور معمولی نہیں، بلکہ ایسے کہ جن پر ادب اور زبان ناز کر سکے۔ ہم اتنی روانی کے ساتھ نثر نہیں لکھ سکتے جس روانی کے ساتھ وہ اشعار تصنیف کیا کرتے تھے۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ اشعار فی البدیہہ اور فوری طور پر کہے گئے ہیں۔ بلکہ یہ گمان ہوتا تھا کہ بہت پہلے کبھی کہے ہوں گے اور اب سنا دیئے۔ وہ شعر کہتے وقت سوچتے بالکل نہیں تھے اور نہ انھیں دماغ پر زور دینا پڑتا تھا۔ اُن کا دماغ گویا اشعار کی ایک مشین تھا جس میں سے بڑی تیزی کے ساتھ اشعار نکلے چلے آتے تھے۔

سلیم کے کلام کی خصوصیات اور اُن کی نظم کے محاسن مختصراً یہ ہیں کہ اُن کی شاعری نہایت ولولہ انگیز، ہیجان خیز اور جذبات سے بھری ہوئی ہے۔ اس خصوصیت میں وہ اقبال سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اقبال بالعموم مشکل گو ہے۔ اور سلیم کے اشعار سے قریباً ہر لیاقت کا شخص یکساں لذت اندوز ہو سکتا ہے۔ جو روانی۔ جو زورِ بیان۔ جو شیرینی۔ جو حلاوت اور جو علوئے خیال صرف اعلیٰ قابلیت کا انسان اقبال کے کلام میں پاتا ہے، وہی لطافتیں ایک بلند پایہ ادیب کو بھی سلیم کی شاعری میں نظر آتی ہیں، اور ایک معمولی لیاقت کے شخص کو بھی یعنی اپنے اپنے ذوق کے مطابق ہر قابلیت کا انسان سلیم کے کلام سے لطف حاصل کر سکتا ہے۔

قوم کے نام اقبال و سلیم دونوں کا پیام ایک ہے۔ دونوں خودی اور بے نیازی

کی انتہائی تعلیم دیتے ہیں۔ دونوں اپنے پڑھنے والوں کو آسمانوں، بلکہ عرش سے بھی اونچا اُڑتے دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ دونوں اپنی ذات پر توکل کرنے اور اپنے اوپر بھروسا کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ دونوں کو ہرگز یہ بات گوارا نہیں کہ کوئی انسان اعلیٰ علیین سے ذرا بھی پستی کی جانب نظر کرے۔ وہ بڑے زور سے اس امر کی تاکید کرتے ہیں کہ ہمیشہ اپنے ارادے اور اپنے خیال کو بلند سے بلند تر اور ثریا سے بھی اونچا رکھو۔ اپنی نگاہ میں وہ وسعت پیدا کرو جو ہفت افلاک سے بھی پرے دیکھ سکے۔ دونوں کا قول تھا کہ ناکامیوں سے گھبرا جانا ہرگز ہرگز طریق مردانگی نہیں۔ اپنے ارادے میں اس قدر استحکام پیدا کرو کہ دس ہزار بار ناکامی پر بھی پائے ثبات کو لغزش نہ ہو۔ نہ طبیعت گھبرائے۔ نہ ہمت میں ضعف آئے۔ کامیابی صرف ہمت اور عزم راسخ کی لونڈی ہے۔ اور اقبال کا سایہ صرف اُن قوموں پر رہتا ہے جو کبھی کسی ناکامی یا مصیبت کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ بلکہ ناکامیاں اُن کی قوتِ عمل میں مزید جوش پیدا کردیتی ہیں

پیرایۂ بیان دونوں کا نہایت شگفتہ۔ دل نشین اور پُرشوکت ہوتا ہے۔ فصاحت و بلاغت اور شیرینی کلام میں دونوں مساوی حیثیت کے مالک ہیں۔ البتہ حسبِ ضرورت نئے الفاظ بنانے اور جدید ترکیبیں وضع کرلینے کے فن میں نہ اقبال اور نہ کوئی اور ادیب تسلیم کی ہمسری کا دعویٰ کرسکتا۔ مخدومی مولوی عبدالحق صاحب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

"وہ الفاظ کے کینڈوں اور اُن کی فطرت کو خوب سمجھتے تھے اور جدید لفظوں کی تلاش یا نئے لفظوں کے بنانے میں کمال رکھتے تھے۔ وہ لفظ ایسے موزوں اور جلد بناتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا، گویا اُن کے دماغ میں سانچے بنے بنائے رکھے ہیں، جن میں سے الفاظ

ڈھلتے چلے آ رہے ہیں"۔ (چند معصر)

غم انگیز اور یاس آمیز شاعری سے اقبال اور تسلیم دونوں کو نفرت ہے۔ بلند خیالی اور آزادروی دونوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ خوشامد اور قصیدہ خوانی کے "فن لطیف" سے دونوں محروم ہیں۔ ہجر و وصال، حسن و عشق اور زلف و کمر کے فرسودہ مضامین سے دونوں کا کلام خالی ہے۔ مگر قدرت کی دلفریبیوں اور نیچر کی رنگینیوں پر دونوں فریفتہ ہیں۔ مناظر قدرت اور فطرت انسانی کی شاندار تصویریں کھینچنے میں دونوں کو کمال حاصل ہے۔ اولوالعزمی کی تعلیم اور ہر ہستی سے اپنے آپ کو بالاتر سمجھنے کی تبلیغ دونوں کے ہاں پوری قوت سے موجود ہے۔ جہاں اقبال کہہ رہے ہیں کہ ع "اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے" وہاں تسلیم دعوت دے رہے ہیں کہ ع "نطے اگر خوں کے سمندر تجھے کرنے ہیں تو آ"

غرض شاعری کے میدان میں اقبال اور تسلیم خوش خرامی کے ساتھ ایک ہی راستہ پر گامزن ہیں۔ دونوں کا کعبۂ مقصود ایک ہے۔ اور دونوں اپنے پیروؤں کو دنیا کی ہر شے سے بے نیاز اور ہر چیز سے بے پروا دیکھنا چاہتے ہیں۔ دونوں یہی تلقین کرتے ہیں کہ اپنا عزم اتنا بلند بناؤ کہ طائر خیال بھی وہاں تک نہ پہنچ سکے۔ اپنا ارادہ اس قدر مضبوط رکھو کہ مصائب کی آندھیاں اور مشکلات کے طوفان اسے متزلزل نہ کر سکیں۔ تم پانی سے زیادہ رواں اور پہاڑ سے زیادہ مستحکم بنو۔ تم زمانہ کے ساتھ مت چلو۔ بلکہ زمانے کو اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کرو تم اپنی زمین نئی بناؤ اور اپنا آسمان نیا تیار کرو۔ مصائب کے گرداب میں تم اپنی کشتی عمداً ڈال دو۔ اور مشکلات کے بھنور میں تم خوشی سے کود پڑو۔ غرض بقول مولوی محمد امیر صاحب

اورنگ آبادی، "اقبال اور سلیم دونوں ایک بانسری کی دو صدائیں ہیں۔ ایک اونچی اور خوشگوار اور دوسری دبی اور لطیف"۔

سلیم کی تمام شاعری اسی قسم کے افکار و خیالات سے مملو ہے جو اوپر بیان ہوئے ان کی شاعری میں اخلاق اور تصوف کے عمدہ سے عمدہ نکتے ملتے ہیں۔ فلسفۂ جدیدہ کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے۔ اور حبِ انسانی کی تلقین جابجا دکھائی دیتی ہے۔

سلیم اقبال کی طرح ایک پیغام گو شاعر ہے۔ جو قدرت اور نظام کائنات کے ذرّے ذرّے سے خود سبق لیتا اور دوسروں کو اس کا درس دیتا ہے۔ اُس کا نظریۂ زندگی نہایت بلند ہے۔ وہ انسان کے عزائم اور اس کے خیالات میں ایک زبردست انقلاب دیکھنے کا آرزومند ہے۔ اُس کی آنکھیں ایک درخشاں مستقبل کا نظارہ کر رہی ہیں۔ اُس کی روح بلند سے بلند نشیمن کی تلاش میں سرگرم جستجو ہے۔ وہ نہایت زندہ دل شاعر ہے۔ اور دوسروں کو اپنے جیسا بنا دینے کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ اُس کی نظمیں تازگی اور شگفتگی کا دلفریب نمونہ ہیں اُس کے کلام کے ہر لفظ میں زندگی اور اُولوالعزمی بھری ہوئی ہے۔ سونے والوں کو بیدار کرنا ڈوبتوں کو تیرانا۔ گرتے ہوؤں کو سنبھالنا غافلوں کو ہشیار کرنا۔ کاہلوں کو چست بنانا پست ہمتوں کو اُبھارنا اس کی شاعری کا ماحصل ہے۔ ہنگامہ آرائی، اولوالعزمی، خودی اور خودداری وہ خاص چیزیں ہیں جن سے سلیم کا تمام کلام بھرا پڑا ہے۔

اپنے اوپر بھروسا کرنے اور ضرورت کے وقت ہر امداد سے مستغنی رہنے کی تعلیم کس بے نیازی سے دیتا ہے۔ ؎

زنہار نہ ملاح سے امداد طلب کر طوفاں بھی گر آ کر تری کشتی سے لپٹ جائیں

وہ اپنے آپ کو سب سے ارفع و اعلیٰ سمجھتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ع

"مرے شہپر کے سائے میں ہے سارا عالم امکاں"

دیکھئے کس خوبصورتی سے وہ اپنے آپ کو کائنات کی ہر ہستی سے مستغنی ثابت کرتا ہے

غیرت یہ ہے کہ چاند بھی بن جاؤں میں اگر طالب نہ ہوں گا نور کا میں آفتاب سے

سلیم جمالیات کا عاشق زار ہے۔ لیکن اس کے لئے اس نے بالعموم مظاہر قدرت کا انتخاب کیا ہے۔ بقول اکبر الہ آبادی۔ ؎

حسن جس چیز میں ہو دیکھ کے خوش کر دل کو بند کر لے مگر آنکھیں اگر انسان میں ہو

اس کے کلام میں فطرت کے حسن اور قدرت کی رنگینیوں کے ایسے ایسے دلکش نقشے موجود ہیں کہ پڑھکر صاحب ذوق انسان پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ ہمارے شعراء کے وضعی معشوق کا پرستار نہیں۔ بلکہ قدرت کے مظاہر اور فطرت انسانی کے اعلیٰ جذبات کا والہ و شیدا ہے اور اسی لئے اس کا کلام پاکیزہ احساسات سے لبریز اور اخلاق و تصوف کے گہر ہائے نایاب سے مملو ہے۔ اسکی نظمیں بغیر تمیز مذہب و ملت، ہمدردی۔ یگانگت۔ اور حب انسانی کی تعلیم دیتی ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کو اس دنیا میں لیجانا چاہتا ہے جہاں سدا بہار ہی بہار ہو۔ اور دل انسانی کسی بات سے مکدر اور کسی امر سے منغض نہ ہو۔ جہاں ذرہ ذرہ میں حسن۔ محبت اور لطافت موجود ہو۔ دوسرے مذاہب یا فرقوں پر آوازے کسنا۔ ان کا مذاق اڑانا۔ یا ان پر پھبتیاں کہنا جس سے افسوس ہے کہ اقبال کا کلام بھی خالی نہیں، سلیم کے ہاں قطعاً معدوم ہے۔ اسے صرف اپنے کام سے کام ہے۔ باقی وہ

دُنیا کی ہر چیز سے بے تعلق ہے۔ تعصب اور دل آزاری کا ذرا سا بھی شائبہ اُس کی نظموں میں کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کا بہت بڑا حامی اور علمبردار ہے۔ ساری عمر کبھی کوئی شعر ہندوؤں یا اُن کے معتقدات یا اُن کے پیشواؤں اور لیڈروں کے برخلاف نہیں لکھا۔ اُس نے اپنی نظموں کو طنزیات، مضحکات اور سیاسیات سے بالکل پاک رکھا ہے۔ بیشک آزادی کا زبردست جذبہ اس کی روح میں موجود ہے۔ گویا کسی نے یہ شعر سلیم ہی کے حسب حال لکھا ہے۔ ؎

احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے　　نکل جاتے مگر رستہ نہ پایا

مگر باوجود اس کے اُس "آزادی کامل" کی طلب جو موجودہ سیاسیات سے متعلق ہے، سلیم کے کلام میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ اُسے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی جن خیالات میں وہ مگن رہتا تھا، وہاں ایسے امور کا گذر کبھی ہوتا ہی نہ تھا۔ اُس کی زندگی اس مصرع کی تفسیر تھی۔ ع

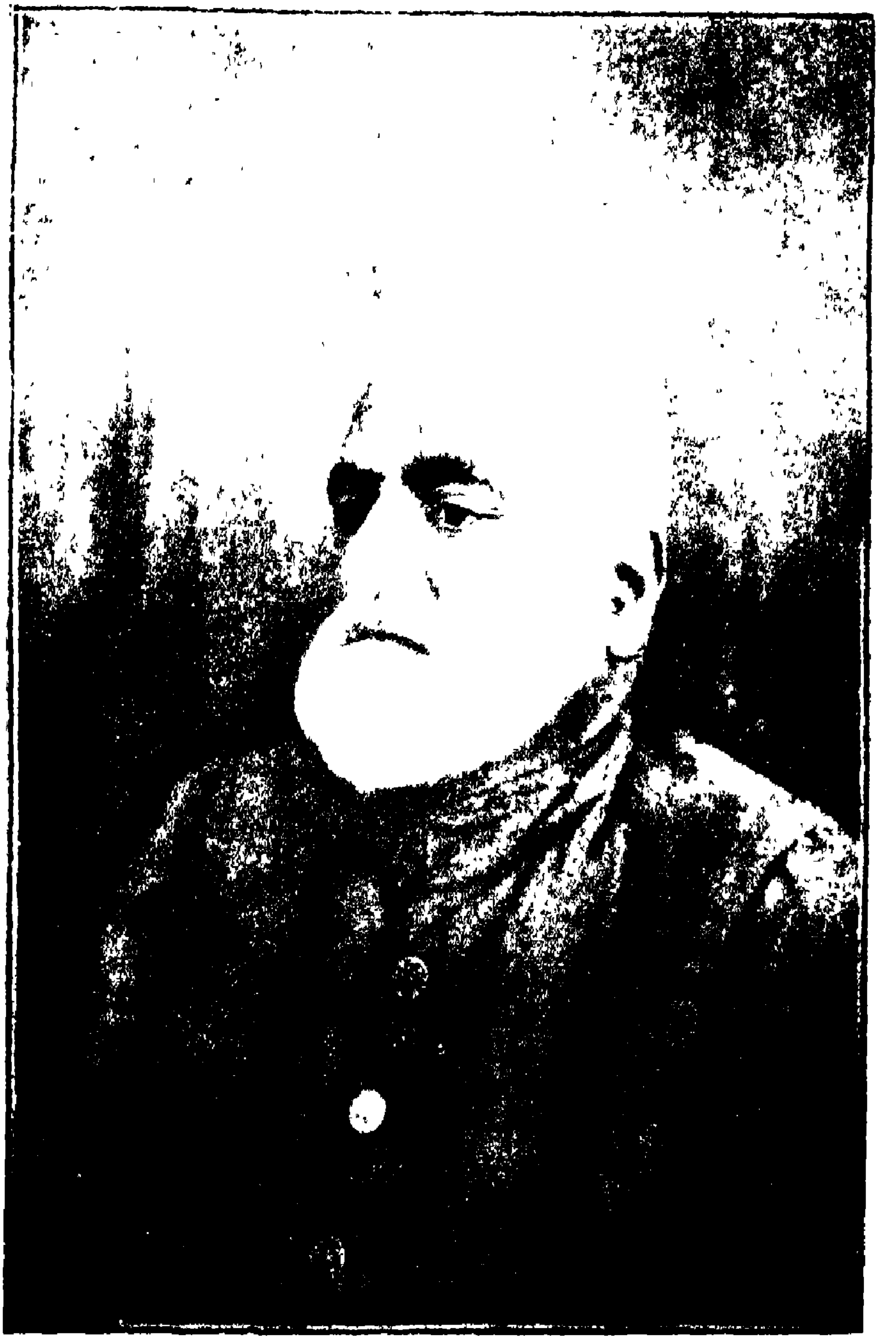
مجھ کو کیا مُلکوں سے میرا مُلک ہر سے جُدا

ادبی حیثیت سے اُس کا کلام نئے نئے استعارات، لطیف سے لطیف تشبیہات، انوکھی تراکیب بنچے تلے الفاظ کا ایک حسین اور دلفریب مرقع ہے۔ معمولی لفظوں میں جان ڈال دینا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس کی زبان سادہ ہونے کے ساتھ غایت درجہ شیریں ہے۔ اور اُس کا بیان بلیغ ہونے کے ساتھ نہایت درجہ سلیس ہے۔ موسیقیت اُس کے ایک ایک شعر سے ٹپکی پڑتی ہے۔ بھرتی کے اشعار اس کے مُنہ سے کبھی نہیں نکلتے۔ نظموں میں معمولی، عامیانہ اور چھوٹے خیالات کا اظہار وہ اپنی بلند شخصیت کی ہتک سمجھتا ہے۔ ثقالت۔ بے ربطی اور خشکی اس کے اشعار میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ مختصر یہ کہ اُس کا کلام ظاہری حسن، باطنی خوبیوں اور ادبی جدت طرازیوں سے مالامال ہے

اور ہمیں یقین ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا اُس کے کلام کی قدر و عظمت بڑھتی جائے گی سلیم کے کلام کا کچھ حصہ ایسا بھی ہے۔ جو انگریزی نظموں کا ترجمہ ہے۔ اس میں بھی اُس نے کمال کر دکھایا ہے۔ اور ترجمہ میں اتنا زور۔ اتنا جوش۔ اتنا اثر۔ اتنی روانی اور اس قدر دلچسپی اپنی قادر الکلامی سے پیدا کر دی ہے کہ اصل میں بھی اتنی نہ ہوگی۔ سلیم نے ان تراجم کے ذریعہ یہ کلیہ غلط ثابت کر دیا کہ "ترجمہ میں اصل کا زور باقی نہیں رہتا"۔ اس کی وقعت اُس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ شاعر انگریزی سے ناآشنا تھا۔ کسی سے اُردو نثر میں ترجمہ کروا لیا جاتا، اور پھر اپنی جولانی طبع کا آزادی سے استعمال ہوتا تھا۔

یہ ہے مختصر بیان سلیم اور اُن کی شاعری کا تاہم میں نے کوشش کی ہے کہ اس مختصر میں بھی سلیم کے کلام کی خصوصیات کچھ جامعیت کے ساتھ بیان ہو سکیں۔ خدا کرے میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا ہوں۔ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو کسی دوسرے وقت سلیم کی شاعری، اُن کی نثر نگاری اور ادبی حیثیت پر ایک مفصل تبصرہ علیحدہ قلمبند کروں گا۔ فی الحال انہی سطور پر اکتفا فرمائیں۔

(خاکسار محمد اسماعیل)



مولوی سید وحیدالدین سلیم پانی پتی

تذکرہ سلیم

(انتہائی اختصار کے ساتھ)

مولانا سید وحید الدین سلیم ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام حاجی سید فرید الدین تھا جو درگاہ حضرت
بو علی شاہ قلندر کے مجاور اور مولینا سید غوث علی شاہ صاحب کے مرید تھے۔ عمر پڑھنے کے قابل ہوئی، تو شمس النسا نام ایک استانی
کے سپرد کئے گئے۔ جہاں انھوں نے قرآن شریف حفظ کیا۔ پھر میر علی نقی حزیں سہارن پتی سے کچھ فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اِسی
دوران میں شاہ صاحب نے انھیں مقامی میونسپل بورڈ سکول میں داخل کرا دیا اور سارا خرچ خود برداشت کیا۔ حافظہ بلا کا
پایا تھا۔ ۱۸۸۲ء میں جب مڈل کا امتحان دیا تو پنجاب بھر میں اول آئے۔ چار روپے ماہوار وظیفہ ملا۔ اور یہ اورینٹل کالج لاہور
میں پڑھنے کے لئے چلے گئے۔ جہاں عربی ادب اور تفسیر مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے۔ اور فقہ، حدیث، منطق اور فلسفہ
مولانا عبداللہ ٹونکی سے حاصل کیا۔ منشی فاضل کے امتحان میں بھی فرسٹ پاس ہوئے۔ بعدازاں قانون کی کلاس میں
داخل ہو گئے۔ ضروریاتِ معاش سے مجبور ہوئے تو اُسے چھوڑ کر ایجرٹن کالج بہاولپور میں ادب اُردو کے معلم مقرر ہو گئے
چھ سال کی ملازمت کے بعد مدرسہ عالیہ رامپور میں ہیڈ مولوی ہو کر چلے گئے۔ پورے چھ ماہ بھی ملازمت کو نہ ہونے
پائے تھے کہ سخت بیمار ہو کر پانی پت چلے آئے۔ اب انھوں نے طب پڑھی اور پانی پت میں دواخانہ کھول لیا۔ طبابت
بھی کرتے اور دوائیاں بھی فروخت کرتے۔ مگر یہ کاروبار نہ چلا۔ اور سخت تکلیف میں بسر ہونے لگی۔ اس پر حضرت شمس
العلماء مولانا حالی جولائی ۱۸۹۲ء میں انھیں اپنے ساتھ علی گڈھ لے گئے۔ اور سر سید سے سفارش کی۔ سر سید نے اُن کی
لیاقت اور تبحر علمی سے متاثر ہو کر انھیں اپنا لٹریری اسسٹنٹ بنا لیا۔ اور وہ اس خدمت پر سر سید کی وفات (۲۷ مارچ ۱۸۹۶ء)
تک مامور رہے۔ سرسید کی وفات کے بعد انھوں نے "معارف" کے نام سے ایک اعلیٰ پایہ کا علمی رسالہ نکالا۔ جس کا

پہلا پرچہ یکم جولائی ۱۸۹۸ء کو شائع ہوا۔ نومبر ۱۹۰۰ء میں اس رسالہ کو پانی پت لے آئے۔ اور دسمبر ۱۹۰۱ء میں اسے بند کرکے "حالی پریس" کے نام سے ایک مطبع قائم کرکے کتابوں کی تجارت شروع کی۔ ۱۹۰۷ء میں نواب محسن الملک نے "علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" کی ایڈیٹری کے لئے بلایا۔ دو سال وہاں رہے، پھر بیمار ہو کر گھر چلے آئے کچھ صحت ہوئی تو مسلم گزٹ لکھنؤ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اسی زمانہ میں مسجد کانپور کا جھگڑا چل پڑا۔ مولانا نہایت آزادی پسند تھے۔ آپ نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "اگر میں کانپور کا کلکٹر ہوتا؟" نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں ۱۲ گھنٹے کے اندر شہر چھوڑ دینے کا حکم ملا۔ وہاں روزنامہ زمیندار کی کرسی ادارت ان کا انتظار کر رہی تھی، مولینا پہنچے تو اشاعت ایک دم ستر ہزار روزانہ ہو گئی۔ مگر تھوڑے ہی عرصے بعد مولانا کی آزادروی اور آزادنگاری کی بدولت ضمانت پریس اور اخبار سب ضبط ہو گیا۔ اور مولانا پانی پت آن بیٹھے۔ یہاں بیکاری کے دن سخت عسرت میں بسر ہو رہے تھے کہ دارالترجمہ سرکار عالی کی طرف سے بلاوا پہنچا۔ اور آپ نے فوراً حیدرآباد پہنچ کر ۱۰ رمہر ۱۳۲۸ف کو چارج لے لیا۔ بعد ازاں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہونے پر آپ کو اس میں لے لیا گیا۔ اور اسی خدمت پر آخر تک رہے ۷ ماہ کی سخت تکلیف دہ علالت کے بعد ۲۹ رجولائی ۱۹۲۸ء کو ملیح آباد میں انتقال فرمایا۔ اور دنیائے اردو ایک زبردست ادیب سے محروم ہو گئی۔

(خاکسار محمد اسماعیل پانی پتی)

افکار سلیم

قصیدہ در شان پیر غوث علی شاہ صاحب

(چودہ برس کی عمر کا کلام)

مولوی سید وحید الدین سلیم نے، جبکہ اُن کی عمر صرف چودہ سال کی تھی اور وہ گلستان کا تیسرا باب پڑھتے تھے، ۱۲۹۷ھ میں اپنے پیر سید غوث علی شاہ صاحب کی تعریف میں مندرجہ ذیل ایک سو ایک فارسی اشعار کا پُر زور قصیدہ تصنیف کیا اور ان کی خدمت میں سُنایا جس کو سُن کر پیر صاحب بیحد محظوظ ہوئے۔ اور اپنی چادر اور ایک اشرفی انعام کے طور پر انھیں دی یہ قصیدہ ایسے زور شور کا تھا کہ اس کا سمندِ سخن انوری و خاقانی سے ہم عناں معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ انھوں نے ایسے لطف و خوبی اور دھوم دھام سے

مجمع کثیر میں پڑھا کہ ارباب محفل دنگ اور ششدر رہ گئے۔ بعض مستمعین نے اس گمان سے کہ شاید لڑکا طوطی کی طرح زبان گویا رکھتا ہے، اور طبیعت اس کی فہم مضامین و معانی سے نا آشنا ہے، اُن کا امتحان کیا۔ اور جو مطالب و اصطلاحات ادق اُن کے کلام میں وارد ہوئے تھے، اُن سے استفسار کئے۔ انھوں نے ہر ایک سوال کا جواب شرح و بسط کے ساتھ ایسے اسلوب سے بیان کیا کہ گویا اُن کی طبع بلند اور اُن کا ذہن رسا ان مباحث و علوم پر حاوی ہے۔ قصیدہ حسب ذیل ہے۔ (تذکرۂ غوثیہ" ص ۴۰۷-۴۱۲)

صبح دم مہرۂ زر چرخ چو افشاند ز چنگ — خاطرِ ما شدہ بلبل بہ ریاضِ فرہنگ
زدہ سر پا بہ سرِ چرخ سمندِ خامہ — کہ بجولاں دہم از رنگ رنگِ شبرنگ
ساحتِ متسع عرش رواں کن بہ نورد — کہ بتوصیف جنابے زدہ مفتوں آہنگ
آں جنابیکہ چو از رفعتِ او کرد ہراس — ہفت طاقِ فلک آمد بوجودِ او ننگ
جنبش آید بسفینہ بسہیل از فرش — با چل و چار سوارش چو بجوشید م رنگ
چوں ہیولائے تجلیش بینگارد برق — شمع او مردہ کند سرزنش صرصر تنگ
طرفہ آئینۂ قلبش کہ ز تاب عرفاں — درو از جوہر فرد آمدہ کم نقطۂ زنگ
چہ عجب گر ز یکے جلوہ بد شستِ شوقش — ذرّہ ذرّہ شود از فرط تپش برق آہنگ

فیض او خضری بخشد چو پے روئے شرار | سبز و خضرا کند ش سبزه صفت مخمل رنگ
روئے اقدس شده با مهر پیٔ نمایش و حرب | نعل کفش به هلال آمده در حربه و جنگ
عقل و دانش شده با جوهر علویش عرض | جوهر فرد و قلابش فلک اخضر رنگ
جذب و دفع از و نشو و نما چوں پابند | آتش و آب به تمیز نمایند دو رنگ
عقده‌ها حل کند از چشم زدن تنگ و مضیق | که بود غنچهٔ منطق به لب غایت تنگ
طے کند فاصلهٔ جذر قدم قلب رسا | قلب او قلب کند چوں زر در فش نیرنگ
شمسهٔ حضرت او شمس رساند بثریٰ | که شد از ضبط علو بر فلک رابع تنگ
خشم را بار غضب خشم نهد بر نایش | رفق را رفق دهد گوهر رفقت در چنگ
اشعهٔ پرتو او گر نه دهد تاب بشمس | نقش بندد به تصاویر نه از عکس رنگ
علم حشمت او تا به فلک جائے گرفت | حوت را دوخته چو ماهی و مراتب در رنگ
پرتو نو فتد گر به یم مصر و شش | مرغ زریں نه کشد شهپر انور به فرنگ
به نوگشته فلاخن به ید حاجب شمس | که کند بر سر جالوت ظلامش آهنگ
بحر جودش زند ار جوش چو بحر ثالث | ماه در بحر خضر غوطه خورد ماهی رنگ
توسن حشمت او گر بود اندر جولاں | توسن چرخ نه ایں قدر بود شوخ و شنگ
تا بد از نور فروزانش بگردوں هم | ماه و خورشید کند جست بسویش چو پلنگ

علمِ رفعت او تا کہ زر فرف سازد — پرچم خویش ازان است بعرشِ اندر جنگ
خلق داند بدم نورشعاع خورشید — نے لے فرش زدہ بر سینہ او الف خدنگ
رفعتش قوس قزح را بخم و پیچ انداخت — زاں برآں شمس چو حر باکند از رنگے رنگ
لعل گویند و لے پارۂ از خوں باشد — شوکتے پارہ کند در جبلش سینہ سنگ
رتبہ فرحت و تنشیط بعہدش افزود — لالہ را جام لبالب شدہ از خمر فرنگ
یعنی بحرِ کرم جودِ شہِ غوث علی — قبلۂ عالمِ لاہوت و شہ چرخ اورنگ
کعبۂ ہر دو جہاں خسروِ خسرو دیہیم — مسند آرائے وشہ کشورِ عقل و فرہنگ
کاشف سر نہاں ، واقف علمِ مکتوم — حضرت اقدسِ ظل اللہ و دانش آہنگ
در دل آمد کہ کنم مطلعِ دیگر رقیم — کہ سراپا بود از مطلعِ نورِ فرہنگ

المطلع الثانی

ایکہ از قہر تو چوں برق تپد جوہر سنگ — وے کہ روشن ز تو شد کوکب برج فرہنگ
مرکزِ دائرۂ سبز ز نورت بو دار — برق را بر روشِ جست بود جادۂ تنگ
سُبحۂ عقد ثریا بیدِ اقدس تو — گر بود مستی نازش بگذارد بہ شلنگ
خامہ از مدح تو تحریر کند با شنگے — جست از دست زند مست برنگِ شبرنگ
تا تماشائے شگفتن ز دلت بیند شمس — خواہد اندر چمن تو کہ بود غنچۂ تنگ

دریم نورِ تو اندر صدفِ سینهٔ تو — یافته پرورش از فیضِ تو دُرِّ فرهنگ

دعویِ همسری سازند چه رو کردند ت — مه و خورشید حضورِ رخِ اقدس بیرنگ

جلوهٔ تو علم ار برق وش از فرهٔ کشد — همچو خورشید بسوزد رخِ خوبانِ فرنگ

در گلستانِ پناهِ تو برائے دشمن — گل صبح آمده جا بد ز هر غنچهٔ تنگ

مانیِ دل کشد از نقشِ تو بر غنچهٔ خویش — دلِ طاؤس کشد نقشِ برقصِ آهنگ

فیضِ نورِ دلِ شفافِ تو انست کزو — جگرِ لاله بتبدیل کشد نقطهٔ زنگ

خضر سازد بقدمبوسیِ تو، گر شود دشس — اے شهنشاهِ معلی طبق نداورنگ

بشکند شیشهٔ زیرواز فلک را باشد — وصفِ صولت اگرت نقشِ سرِ صفحهٔ سنگ

تا که بر حرفِ تقابل کشد از روئے تو خط — رخِ گل بادِ صبا کرد ز سیلی گلرنگ

قطعه ۱

کورِ شقری اگر از خاکِ پیت در دیده — افگند اے شه خورشید کله چرخ اورنگ

بهرِ دیدارِ همه صورتِ معدوم کند — از سراپردهٔ بینش بیک آوان آهنگ

قطعه ۲

در فراتِ اے شه اگر کار تعذیب دهیش — چو به گستاخیِ تو چرخ بسازد آهنگ

بر تنِ خویش تند از طرب این منشور — کشتیِ چرخ شکسته کند اندام نهنگ

ابر جود تو بہ نیساں زند از آب حیات | قطرہ را سوئے صدف باشد از وجا ؤ تنگ
خون طوطی بیکے دشنۂ موج ابیض | ریختہ قلزم شفافیت تو نادر و درنگ
ہر مثلث کندش تا کہ خجل کیکاوس | ساختہ سبحہ تو عقد ثریا آونگ
گر قدم رنجہ بفرمائے بہر وادی شوق | افتد از قلعۂ تن طائر جاں صد فرسنگ
بارسطو و فلاطون بجولانگہ عقل | خاطر اقدس تو برق ہماندہ شبرنگ
قیصر و خسرو و خاقاں زغلامان تو اند | در شہنشاہی عرفاں شدہ زیبت اورنگ
اے مدیح تو غضب مطرح و جولانگاہ است | کاشہب خامہ یا قوت فشاں گشتہ لنگ
آید از شعلۂ او لعل بصد جلوۂ طور | شر را فگندۂ از جلوہ اگر در دل سنگ
چشم نظارگیان قسمر انوار ست | چہ عجب پیکر کہکش بہ بیاں آرد رنگ
جوہر کل بجسم آید بظہور عقلت | ذات پاکت شدہ محو رہیان فرہنگ
بار یابند نہ زنہار ز اجرام فلک | سایۂ تو کشد اندر یم خضرا چو النگ
نسر طائر جہد از شوکت تو گر بزمیں | پر پرواز زند مغفر خاقاں چو کلنگ
آتش قہر تو گر شعلہ رساند بکند | صوت طوطی پئے خونریزی طاؤس درنگ

قطعہ ۳

شاہد طبع من آمد چو پس نام جناب | بر سر جوشش معنی بہ بجا رفتہ ہنگ

گفت پیر خردش طعنهٔ امساک مدیح / زان گهر ریختن از عقد سخن کرد آهنگ

دانکه ریختهٔ لولوی معانی طبعم / عرق افشردهٔ پیشانی خویشم شبرنگ

پس همه مستعد مدح تو گشتند ولی / حرفی نادر در مدح تو ادایم فرهنگ

زان رخ جنگ کن آمد بدم عربدهٔ مریخ / ریختهٔ خنجر تو خون گلوی گل جنگ

نور روی تو اگر در دهدش حسن فروغ / شرر طور بخیزد ز دل غنچهٔ تنگ

سبزهٔ گلشن قهر تو ز عکس موهوم / روی مریخ فلک را بکند اخضر رنگ

مرآت خاطر تو جلوهٔ کونین نمای / وی ضمیر تو شده خازن گنج فرهنگ

مهرهٔ بیضه شود از شرر جلوهٔ تو / در ید عیسی افلاک نشین لعبت سنگ

ز آتش غیرت جود تو اگر سوخته نیست / لعل در کان بدخشان شده چون آتش رنگ

نگذارد غضبت گرچه عدو بگریزد / پهن ارض و فلک آید نظرش سخت تنگ

هست از رفق و غضب مختلطت زان هردم / گاه منصور و گهی خسته شود لشکر زنگ

قطعه

منشی چرخ بمدح تو ز گردون آید / در فرات آمده اول کند این خوش آهنگ

کلک یاقوت فشان خار برآورده بپیش / پشت ماهی شود از نقش و نگارش ارژنگ

گر بصد سال کند مشق مدیح پاکت / آخر از طعنهٔ طبعم فتد آن نیز برنگ

ہم کو اپنے ہی پیمبر کی قسم اے خاکِ ہند — آج گو شکووں سے ہیں لبریز ہم اے خاکِ ہند

ہیں مگر احسان اگلے تیرے سب خاطر نشاں

نعمتیں جی کھول کر دیں تو نے کھانوں سے سوا — تو نے خاطر داریاں کیں مہمانوں سے سوا

ہم نے پایا تجھ کو محسن میزبانوں سے سوا — تو نے بیگانوں کی خاطر کی یگانوں سے سوا

میہماں تھے پر بنایا تو نے ہمکو میزباں

سبزہ زاروں پر ترے ہم لوٹتے ہیں جا بجا — ہو گئی خواب و خیال اب دیس کی آب و ہوا

باغ سبز ایسے دکھائے تو نے ہم کو بارہا — تیرے باغوں کی فضاؤں نے دیئے دل سے بھلا

شعب بوان و سمرقند و دمشق و اصفہاں

چاہِ زمزم تھا ہمارا چشمۂ آبِ حیات — نیل و جیحوں کو کیا تھا جس کی شیرینی نے مات

یاد اب بالکل نہیں اپنے وطن کی کوئی بات — یاد کچھ جیحوں رہا ہم کو نہ دجلہ اور فرات

تیرے گنگا جل نے جب سے ترکئے کام و زباں

اب کہاں وہ خاکِ نیشاپور کی آب و ہوا — اب کہاں وہ مدین و بغداد کے بستاں سرا

اب کہاں وہ فاریاب و طوس کی دلکش فضا — تیرے کاشی کی کشش نے کر دیئے ہم سے جدا

یثرب و بطحا، و صنعا، و زبید و نہرواں

اب کہاں شیراز کے میوے ہوئے جب دل سے محو — ہیں حلب کے اور یمن کے بوستاں اب دل سے محو

بندِ سوم

حکمتِ یونانی و نجمی سیاست ہم میں تھی   تھا یماقِ علم اور مصری فضیلت ہم میں تھی
ہم میں تھی رومی وفا ترکی شجاعت ہم میں تھی   ترکمانی صولت اور مغلی جلادت ہم میں تھی
عزمِ کُردی ہم میں تھا۔ بدوی حمیت ہم میں تھی

نامورِ عالم میں تھے جتنے قبائل ہم میں سے تھے   حمیری اخلاق و شیبانی خصائل ہم میں تھے
غالبی اوصاف و الیاسی شمائل ہم میں تھے   ہاشمی آدابِ عباسی فضائل ہم میں تھے
نطقِ اعرابی و عدنانی فصاحت ہم میں تھی

ہم میں تھے جمشید شوکت، ہم میں تھے دارا حشم   ہم میں تھے کسریٰ عدالت ہم میں تھے قیصر شیم
ہم میں تھے اہلِ شجاعت، ہم میں تھے ثابت قدم   ضربِ کراری و حربِ خالدی رکھتے تھے ہم
سطوتِ حمزی و فاروقی جلادت ہم میں تھی

تھی یہی غیرت تو اکثر باعثِ جنگ و جدال   غیر ہم پر بحث میں لیجائے سبقت، کیا مجال
گرچہ تھے مفلس مگر شاہوں سے دبنا تھا محال   عرقِ غیرت تھی دلیل اپنی شرافت کی۔ نہ مال
جھینپتی ہے جس سے دولت وہ شرافت ہم میں تھی

چین کی دیوار سے تا قلعۂ جبر الٹر   پے سپر ہم نے کئے دُنیا کے سارے بحر و بر
کھونڈ ڈالا تھا سفر میں ہم نے عالم سربسر   آج خاور تھا مقام اپنا تو کل تھا باختر

ہم ہرات و بلخ کو کر سکتے تھے کب دل سے محو
تیرے ذوقِ نیشکر نے کردئے سب دل سے محو

بصرہ و طائف کے نارستان اور خرماستان

عیش کی مستی میں سنکر نغمہ ارگن کا ترے
دیکھکر گھنگور بادل ماہ ساون کا ترے
لہلہاتا دیکھ سبزہ صحنِ گلشن کا ترے
فصلِ گل میں دیکھ کر جوبن نہابن کا ترے

مرو اور شیراز کے بھولے چمن اور گلستاں

ہیں چھپے سبزے میں تیرے مرغزار اور کوہسار
جن کے دامن میں ہیں زنگار رنگ پھولوں کی بہار
سبز پودوں کے ہیں ٹھنڈا اور صاف چشموں کی قطار
تیرے سرسبز پہاڑوں نے دیا دل سے اتار

نہر رکنی اور گلگشتِ مصلّیٰ کا سماں

نُقل تر تھا ریاضت میں ہمیں کھانا حرام
کب متنجن اور مزعفر کا سنا تھا ہم نے نام
ہم نے کب کھائے تھے پہلے اس تکلف کے طعام
دعوتیں بھولیں سمرقندی و شیرازی تمام

اس قدر الوانِ نعمت کے لگائے تو نے خواں

نقش ہیں دل پر ہمارے سب مداراتیں تری
ہم نہ بھولیں گے کبھی دن تیرے اور راتیں تری

بند دوم

اس زمیں سے تھی عرب کی اور کچھ آب و ہوا
ملتی اہلِ ہند سے اُن کی نہ تھی خو بو ذرا
گرچہ قسمت کی کشش نے کر دیا یار آشنا
تھی ہماری قوم و ملت رسم و عادت سب جدا

رشتہ وپیوند کوئی ہم میں اور تجھ میں نہ تھا

وضع ہم سے تھی جدا، اے ہندوستاں تیری الگ   تھی جدا تاریخ اپنی، داستاں تیری الگ

تھا بیاں اپنا الگ، اور تھی فغاں تیری الگ   بول چال اپنی الگ تھی اور زباں تیری الگ

تجھ سے ہم تھے اجنبی اور ہم سے تو نا آشنا

اس زمیں میں دیس کی ہر چند خاصیت نہ تھی   گرچہ تھی محنت کی عادت عیش کی نیت نہ تھی

گرچہ ہم سے ملتی جلتی تیری قومیت نہ تھی   ہم میں اے ہندوستاں گو بو ئے جنسیت نہ تھی

تو نے لیکن اپنی آنکھوں پر لیا ہم کو بٹھا

یاد آتا ہے ہمیں اب وہ حجازی کارواں   آئے تھے جس شان سے وہ کر کے یاں نقل مکاں

شکریہ میں تیرے احسانوں کے تھی ورد زباں   تو نے سونپی مہر دولت ہم کو اور طبل و نشاں

تو نے بخشے قصر و ایواں ہم کو اور بستاں سرا

اپنی آنکھوں پر بٹھا کر تو نے عزت دی ہمیں   تو نے اپنے حکمرانوں پر فضیلت دی ہمیں

تو نے راحت دی فراغت دی امارت دی ہمیں   تو نے ثروت دی حکومت دی ریاست دی ہمیں

شکر کس کس مہربانی کا کریں تیری ادا

تھیں یہ ظاہر داریاں تیری، نہ تھیں دلداریاں   یاریاں کیسی کہ یہ در پردہ تھیں عیاریاں

کیسی کچھ دلداریاں تھیں تیری اور غمخواریاں   نبھ سکیں لیکن نہ آخر تک یہ خاطر داریاں

جو دیا تھا تو نے وہ آخر کو سب رکھوا لیا

ہائے وہ شان تجمل، ہائے وہ عز و وقار
اب تری آنکھوں میں ہیں اسطرح ہم خوار و نزار

لے لیا جو کچھ دیا تھا تو نے ہم سے ایک بار
خیر اپنے مال کا تو ہر طرح تھا اختیار

جس سے چاہا لے لیا، اور جس کو چاہا دیدیا

تو نے واپس لے لیا گر ہم سے وہ طبل و نشاں
قصر و ایوان حکومت، سلطنت کا عز و شاں

چھیڑتے ہیں تجھسے کب ہم اُن گلوں کی داستاں
کھینچ لیں اپنی اُسی دم اُٹھکے گُدی سے زباں

بھول کر بھی گر زباں پر اُس کا آ جائے گلا

گرچہ ہم تیرا نہ یہ طبل و علم لائے تھے ساتھ
اور نہ کچھ مال و درم، گنج و حشم لائے تھے ساتھ

گو ترا عیش اور نہ یہ ناز و نعم لائے تھے ساتھ
پر گلا یہ ہے کہ جو کچھ اپنا ہم لائے تھے ساتھ

وہ بھی تو نے ہم سے لیکر کر دیا بالکل گدا

پہلے ہم تہذیب کے پابند تھے ہر بات میں
تو نے وہ اخلاق بھی رکھوا لئے سوغات میں

اب ذرا شائستگی باقی نہیں عادات میں
آدمیت کے تھے جوہر جو ہماری ذات میں

خاک میں آخر دیئے اے ہند سب تو نے ملا

یاد ہو گا تجھ کو یاں آئے تھے ہم کس شان سے
تجھ کو سوگند اپنے ست جگ کی بتا ایمان سے

مخمّسِ تسلیم

شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کے مشہور ترکیب بند موسوم بہ "شکوۂ ہند" پر یہ مخمس تسلیم نے ۱۸۸۹ء میں اس وقت شائع کیا تھا جبکہ وہ ایجرٹن کالج بہاولپور میں ادب اور ریاضی کے پروفیسر تھے۔ یہ مخمس قطعاً نایاب تھا۔ میں نے بہت تلاش سے اسے حاصل کیا ہے۔

(اسماعیل)

بندِ اوّل

قافلہ اسلام کا ہوتا ہے اب یاں سے رواں — روتے روتے اہلِ دل کی بندھ گئی ہیں ہچکیاں
قوم کی ہے ہر صفِ ماتم میں یہ شور و فغاں — رخصت اے ہندوستاں اے بوستانِ بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں
کرتے ہیں یوں تو ہم شکوے بہم اے خاکِ ہند — ہے مگر احساں فراموشی ستم اے خاکِ ہند

عیش و عشرت کی نہ فرصت تھی نہ عادت ہم میں تھی

تھا ہماری کسب روزی کا مشقت پر مدار
کیا فقیر اور کیا غنی، سب ہم میں تھے محنت شعار

بے عوض احسان اُٹھانا تھا کسی کا ناگوار
ننگ تھا ہمکو مشقت سے، نہ مزدوری سے عار

جو بزرگی تھی مشقت کی بدولت ہم میں تھی

لیکے ہم میں شہر والوں سے بیابانی تلک
سہتے سہتے سختیاں پہنچے گرانجانی تلک

قائل اس صبر و تحمل کے ہیں اہل عراق تلک
ہم شتربانی سے پہنچے تھے جہاں بانی تلک

اس لئے باقی شتربانوں کی خصلت ہم میں تھی

ہم میں تھے ہمدرد قومی اور مہذب ہم میں تھے
قوم پر عاشق تھے جو آزاد مشرب ہم میں تھے

کاملوں کے سارے جوہر اور کرتب ہم میں تھے
جو نشاں اقبالمندی کے ہیں، وہ سب ہم میں تھے

حُبِّ دینی ہم میں تھا، قومی مودّت ہم میں تھی

روز مہمانوں کے جمگھٹ یثربی خوانوں پہ تھے
میزبانی حکم ہر شب خانسامانوں پہ تھے

آج کل کیطرح سے کھٹے ہاتھ کب کانوں پہ تھے
گھر ہمارے اور ہم سب وقف مہمانوں پہ تھے

یثربی مہماں نوازی و ضیافت ہم میں تھی

دیکھتے ہیں اب وہی نااتفاقی کا سماں
تھا جو عہدِ جاہلیت میں عرب کا بے گماں

اب کہاں وہ اتحاد اور اب وہ یکرنگی کہاں
پھوٹ سے واقف نہ تھے ہم تیرے اے ہندوستاں

احمدی اخلاق و اسلامی اخوت ہم میں تھی

چھین لی سب ہم سے یاں شانِ عرب آنِ عجم
تو نے اے غارتگرِ اقوام و اکّالِ الامم

بند چہارم

کر رہا تھا کب سے تو اس نحس دن کا انتظار ؟
کب سے تھا برباد کرنے کو ہمارے بیقرار ؟

اب تو کہدے ہاں خدا لگتی، نہ لا دل میں غبار
آئے تھے اے ہندیاں ایسے ہی ہم زار و نزار ؟

ہے عرب کو جن سے ننگ اور ہے عجم کو جن سے عار

تجھ سے ہم اٹھوا کے گنگا جل یہ دیتے ہیں حلف
تو نے دیکھی تھی ہماری ماہ عزت میں کلف

کیا ہمارے ہی تھے وہ فرمانروا جنگی سلف ؟
ہم انھیں اسلاف کے معلوم ہوتے ہیں خلف ؟

جنکی تھی محکوم نسلِ رستم و اسفندیار

جن کے نیزوں نے حریفوں کو کیا زیر و زبر
جنکے گھوڑوں نے کئے پامال بیدینوں کے سر

جن کے حملوں نے کیا تسخیر عالم سربسر
ہم انھیں باپوں کے بیٹے تجھکو آتے ہیں نظر ؟

جن کی جولانگاہ تھی تاتار سے تا زنجبار

ہے رجز خوانی کا ان شیروں کی ہم میں کیا ثبوت
ٹوٹتی تھی جن کی اہل جنگ میں مُہرِ سکوت

جانتے ہیں جنکو تیرے مرہٹے اور راجپوت
ہیں ہمیں اے آریاورت، ان سواروں کے سپوت ؟

جن کی دوڑوں سے ہیں واقف تیرے دشت و کوہسار

کیا ہمارے شہسوار ایسے ہی تھے اے خاکِ ہند؟ کیا ہمارے تاجدار ایسے ہی تھے اے خاکِ ہند؟
کیا ہمیشہ سے نزار ایسے ہی تھے اے خاکِ ہند؟ ہم سدا سے خاکسار ایسے ہی تھے اے خاکِ ہند؟
اُڑتی پھرتی تھی زمانے میں یہی مشتِ غبار

تھا یہی اقبال روشن، جس کی ڈھلتی تھی نہ دھوپ؟ تھی اسی سے ہفت کشور میں ہماری دوڑ دھوپ؟
آن بان ایسی ہی تھی، اور تھا یہی بانکا سروپ؟ تھیں یہی شکلیں ہماری، تھا یہی رنگ اور روپ؟
تھی یہی سیرت ہماری، تھا یہی اپنا شعار ؟

یہ رہیں گی نکبتیں تیری ڈبو کر اب ہمیں یہ رہیں گی ذلتیں دُنیا سے کھو کر اب ہمیں
پہلی عظمت یاد آجاتی ہے رو کر اب ہمیں گر سلف دیکھیں ہمارے زندہ ہو کر اب ہمیں
آئے نسبت اور قرابت پر ہماری اُن کو عار

داستاں ادبار کی اپنی سناتے ہیں جنھیں کہتے استغنا سے ہیں، "افسوس پھر ہم کیا کریں"
دادرس کی بھی نہیں صورت نظر آتی ہمیں سیرتیں تو نے بدل دیں، مسخ کر دیں صورتیں
آبرو تو نے ڈبو دی، کھو دیا تو نے وقار

تھا نہ شاہوں کو یہاں آنا پسند اے خاکِ ہند تھے جو پنہاں تیری رحمت میں گزند اے خاکِ ہند
ہو گئے نامرد آخر فتحمند، اے خاکِ ہند کر دیا شیروں کو تو نے گوسفند اے خاکِ ہند
جو شکار افگن تھے آ کر ہو گئے یاں خود شکار

آ چکے تھے حملہ آور جتنے ہم سے پیشتر　　جو سلوک اُن سے کیا تو نے نہ تھے ہم بھی مگر

پیش آیا اب وہی جس کا دلوں میں تھا خطر　　نکبتیں یہ سب تجھی سے ہمکو آتی تھیں نظر

آئے تھے یاں ہم کہ اپنا چھوڑ کر ملک و دیار

تھا یقیں ہمکو کہ شامت رفتہ رفتہ آئے گی　　ہمکو تو اے خاکِ ہند آخر یونہی کھا جائے گی

بند پنجم

دیکھتے ہیں قوم میں اپنی تنزل عام ہم　　اک زمانہ میں ہوئے، آکر یہاں بدنام ہم

پا رہے ہیں تیرے در سے فقر کا انعام ہم　　دیکھتے ہیں اب یہی آنکھوں سے صبح و شام ہم

جو مداراتوں کا تیری سمجھے تھے انجام ہم

دل کے دل ہی میں رہے نکلے نہ تھے ارمان سب　　محفلیں برہم ہوئیں، جلسے ہوئے سنسان سب

تھے فقط دھوکے کی ٹٹی یہ ترے سامان سب　　توڑ ڈالے جلد تو نے عہد اور پیمان سب

بے وفا سنتے تھے سچ اے ہند تیرا نام ہم

سچ کہا ہے۔ کون ہے پردیس میں کس کا عزیز　　اور نصیب اُلٹیں تو پھر بیگانہ ہے اپنا عزیز

پھر گیا تو ہم سے یوں۔ پہلے نہ تھا گویا عزیز　　دیر تک رہتا ہے جو مہماں نہیں رہتا عزیز

سنتے ہیں دیوار و در سے تیرے یہ پیغام ہم

مورد طعن و ملامت ہیں ہمیں دنیا میں اب　　ہے طبیعت میں ہماری ذوقِ رسوائی عجب

ہم پہ آوازے کسا کرتے ہیں دشمن روز و شب
عیب جو دُنیا میں ہیں وہ ہم پہ تھُپ جاتے ہیں سب

کیا زمانہ میں ہمیشہ تھے یونہی بدنام ہم

ہے عمل کی بے سرانجامی کا پہلے ہی یقیں
تجربہ کیسا۔ کہ ہے خامی کا پہلے ہی یقیں

نام کیا ہو۔ یاں ہے گمنامی کا پہلے ہی یقیں
سب کو ہو جاتا ہے ناکامی کا پہلے ہی یقیں

اُٹھتے ہیں کرنے کو جب ہمت کا کوئی کام ہم

لیکے نکلے تھے وطن سے شوکت و اقبال یہ؟
لائے تھے ہمراہ ہم کیا عظمت و اجلال یہ؟

کیا ہمارے تھے کبھی افعال یہ اعمال یہ؟
تو نے دیکھا تھا کبھی اسلامیوں کا حال یہ؟

کیا عرب سے لیکے نکلے تھے یہی اسلام ہم؟

ہو گا بربادی سے اپنی کیا بتا حاصل تجھے؟
ہو گا مٹنے سے ہمارے کیا بھلا حاصل تجھے؟

مِل گئے ہم خاک میں۔ تو کیا ہوا حاصل تجھے؟
بس۔ زیادہ پیسنے سے اپنے کیا حاصل تجھے؟

پس چکے اے آسیائے گردشِ ایام ہم

آب و دانہ کی کشش تھی جو ادھر لائی ہمیں
گردشِ ایام اِس کج راہ پر لائی ہمیں

تیری کیا تقصیر۔ یاں تقدیر گر لائی ہمیں
شکوہ قسمت کا ہے۔ جو یاں کھینچ کر لائی ہیں

تجھ کو اے ہندوستاں کس مُنہ سے دیں الزام ہم

قافلہ بیٹھے کوئی۔ لٹوا کے ساماں جس طرح
لوٹ جائے شرم سے ناخواندہ مہماں جس طرح

آئے واپس چھوڑ کر فارس کو افغاں جسطرح   پھر گئی سرحد سے تیری فوج یوناں جسطرح

کاش یوں پھر جاتے ترے در سے یونہی ناکام ہم

آکے ہم پردیس میں کرتے نہ دولت کی تلاش   کرتے اپنے ملک میں محنت سے ہم کسب معاش

ہم ہندستانوں میں تیرے یوں نہ کرتے بود و باش   رہتے قانع اپنی محنت اور مزدوری پہ کاش

آکے یاں پاتے نہ ذوق راحت و آرام ہم

دشمن اپنا ہو گیا سودائے جاہ و مال حیف   حرص نے طمع کی شیروں کو کیا روباہ حیف

بند ششم

وہ ہماری قوم کی اب شان و شوکت کیا ہوئی   وہ شرف کیا ہو گیا۔ وہ انکی عظمت کیا ہوئی

اب وہ جرأت کیا ہوئی۔ اب وہ شجاعت کیا ہوئی   وہ مسلمانوں کی ہر بازی میں سبقت کیا ہوئی

وہ حجازی غیرت اور مکی حمیت کیا ہوئی

اپنی شامت سے کیا ہے ہم نے تنگ اسلام کو   ہر کس و ناکس سے پیش آئی جو جنگ اسلام کو

کرتے ہیں مطعون جو اہل فرنگ اسلام کو   ہم مسلمانوں سے ہی اے ہند ننگ اسلام کو

تھا لقب خیر الامم جسکا وہ امت کیا ہوئی

داد پاتے تھے ہم اپنی جرأتوں کی ہر کہیں   تھا بھروسہ عزم پر۔ تھا اپنی ہمت پر یقیں

دل بڑھانے کیلئے کہتے تو ہیں سب آفریں   جی کسی کی عزت افزائی سے خوش ہوتا نہیں

دل گواہی جس پہ دیتا تھا وہ عزت کیا ہوئی

اب نہ وہ اہلِ فضیلت ہیں نہ وہ اربابِ دیں　　اب نہ وہ کشور ستاں ہیں، اب نہ وہ مسند نشیں

اب کہاں وہ برکتیں قومی جو پہلے ہم میں تھیں　　دین و دولت علم و دانش۔ ہم میں کچھ باقی نہیں

حق نے پوری کی تھی جو ہم پر وہ نعمت کیا ہوئی

اب وہ تحقیقاتِ علمی کی کرامت کیا ہوئی　　کیا ہوئے وہ اہلِ حکمت۔ کیا ہوئے وہ فلسفی

کیا ہوا اگر چھن گیا تاج اور دولت لٹ گئی　　ملک و مال و سلطنت اک آنی جانی چیز تھی

جو ہمیشہ رہنے والی تھی وہ دولت کیا ہوئی

علم کی دولت سے ہم میں ہر کوئی مغرور تھا　　حکمت و دانش کا ہر ایک بزم میں مذکور تھا

برِ اعظم میں ترے تاروں سے پھیلا نور تھا　　قریہ قریہ تیرے علم و فضل سے معمور تھا

اب وہ اے اسلام تیری خیر و برکت کیا ہوئی

اب وہ بادل کیا ہوا۔ شاداب عالم جس سے تھا　　اب وہ پرچم کیا ہوا۔ سایہ میں تھا جس کے سما

وہ تمدن کیا ہوا۔ وہ فلسفہ کیا ہو گیا　　جس نے مغرب کو کیا مشرق وہ سورج کیا ہوا

جس سے گھر گھر بن گیا یوناں وہ حکمت کیا ہوئی

اب کہاں وہ قوم کے شاہانِ عالی بارگاہ　　جن کا دجلہ پر علم تھا۔ اور گنگا پر سپاہ

برِ اعظم جن کے تھا گھوڑوں کی ٹاپوں سے تباہ　　کوہ و دریا جن کے ہوتے تھے نہ ہرگز سدِ راہ

وہ ارادے کیا ہوئے اور وہ عزیمت کیا ہوئی

کوئی دنیا کی مصیبت پاس آسکتی نہ تھی — اور کبھی آئے تو جوش اپنا گھٹا سکتی نہ تھی
آنکھ ہم سے کوئی آفت ہو ملا سکتی نہ تھی — کوئی مشکل ہمکو میداں سے ہٹا سکتی نہ تھی

وہ ثبات اور پائیداری اور وہ ہمت کیا ہوئی

ہوگی اپنی قوم کی ہمت شماری تجھکو یاد — ہے ہماری وہ ثبات اور پائیداری تجھکو یاد
داستاں ہوگی ہماری پہلی ساری تجھکو یاد — ہوگی اے ہندوستاں آمد ہماری تجھکو یاد

وہ مسلمانوں کی ہیبت اور وہ صورت کیا ہوئی

وہ بر و دوش اور وہ سینے پہلوانی کیا ہوئے — وہ قد و بالا وہ چہرے ارغوانی کیا ہوئے

بندِ ہفتم

اپنی قومی شان کو ہمت سے چمکاتے تھے ہم — اپنی قومی عزتوں پر صدقے ہو جاتے تھے ہم
جوہر اپنی ہمت و جرأت کے دکھلاتے تھے ہم — جب تک اے ہندوستاں ہندی نہ کہلاتے تھے ہم

کچھ ادائیں آپ میں سب سے جدا پاتے تھے ہم

کبر و نخوت کی ہماری قوم میں عادت نہ تھی — تھی مگر غیرت سے باقی ان کی وضعوں میں کجی
ان کو بھاتی تھی نہ اپنے سے کسی کی سرکشی — اپنی خود کرتے تھے عزت گر نہ کرتا تھا کوئی

سر ہر اک فرعون کے آگے نہ جھکاتے تھے ہم

وقت حاجت درد کی اپنے دوا کرتے تھے آپ　　کام اپنے مستعد ہو کر سدا کرتے تھے آپ
کسب روزی کے لئے محنت کیا کرتے تھے آپ　　حاجتیں ہوتی تھیں جو اپنی روا کرتے تھے آپ
ہاتھ آگے میر و سلطاں کے نہ پھیلاتے تھے ہم

اپنی نانِ خشک کو تھے لقمۂ تر جانتے　　اپنے اُبلے چاولوں کو تھے مزعفر جانتے
تھے اُسے حلوائے جنت ہم مقرر جانتے　　تھے اُسے نعمائے سلطانی سے بہتر جانتے
اپنی محنت سے اگر نانِ جویں کھاتے تھے ہم

اپنے بازو کی مدد سے کرتے تھے پیہم شکار　　مُفت کچھ لینا کسی سے جانتے تھے ننگ و عار
تھا یہی جوہر ہمارا۔ تھا یہی قومی شعار　　تھے نہ کرگس اور زغن کی طرح ہم مردار خوار
تھا وہی قوت اپنا جو خود مار کر لاتے تھے ہم

تھا ثباتِ عزم بھی۔ گر ہم میں تھے علم و ہنر　　وقت پڑتا تھا تو ہو جاتے تھے ہم سینہ سپر
رہتے تھے ہر وقت محنت کے لئے باندھے کمر　　تھی اولوالعزمی و ہمت اپنی مفتاحِ ظفر
چار سو راہیں معیشت کی کھلی پاتے تھے ہم

گرچہ ہمت تھی۔ مگر غیرت کا تھا یہ مقتضا　　مُنہ نہ پھرتا تھا کبھی۔ جس کام کو چھیڑا ذرا
استواری عزم کی تھی اس قدر صبح و مسا　　جب کبھی جس کام کی خاطر۔ جدھر مُنہ اُٹھ گیا
پھر پلٹ کر واں سے خالی ہاتھ کم آتے تھے ہم

شپٹاتے تھے نہ یوں اُنکا رپہ ہم سے کبھی　　دل پکڑ کر بیٹھ جاتے تھے نہ یوں غم سے کبھی
سامنا کرتی نہ تھیں دشواریاں ہم سے کبھی　　جی چُراتے تھے نہ مکروہاتِ عالم سے کبھی
اور خلافِ چرخِ و دوراں سے نہ گھبراتے تھے ہم

تاب کیا لیتا ہے سبقت کوئی قوم اپنے حضور　　تھے چمکتے جب کوئی ہم سے نکلتا تھا دور
رشک تھا جوہر ہمارا۔ جس پہ تھا ہم کو غرور　　اسپِ تازی کی طرح تھی قوم تازی بھی غیور
جب کوئی بڑھتا تھا ہم سے تلملا جاتے تھے ہم

جو مورخ ہے تمام احوالِ عالم چھانتا　　وہ ہماری قوم کے اوصاف سب پہچانتا
رشک و غیرت کو ہماری ہر بشر ہے جانتا　　ہے حمیت کو ہماری اک زمانہ جانتا
سرد ہو جاتے تھے سب جس وقت گرماتے تھے ہم

حال اپنا سخت عبرت ناک تو نے کر دیا　　آگ تھے اے ہند! ہم کو خاک تو نے کر دیا

بندِ ہشتم

ہم میں تھا منحوس وہ جو میزباں ہوتا نہ تھا　　بے سخاوت کوئی مقبولِ جہاں ہوتا نہ تھا
میہمانوں سے کوئی خالی مکان ہوتا نہ تھا　　کھا کے نعمت دل ہمارا شادماں ہوتا نہ تھا
ساتھ دسترخوان پر گر میہماں ہوتا نہ تھا

کرتا گر مہماں کی خاطر سے تکلف کچھ ذرا　　میزباں کو روک دیتا تھا وہ مہماں برملا

میہماں قانع تھا گر۔ تو میزباں مسرف نہ تھا   کرتے تھے مہماں ہمارے ماحضر پر اکتفا

تنگدل مہماں سے کوئی میزباں ہوتا نہ تھا

تھی سلف کی اک علامت ہم میں مہماں پروری   ہم نے پائے تھے سخاوت میں نشانِ سروری

روک سکتی تھی سخاوت سے نہ ہمکو بے زری   ہمکو پہنچی تھی خلیل اللہ سے خواں گستری

عسرت اور تنگی میں بھی طے اپنا خواں ہوتا نہ تھا

کرتے تھے سختی گوارا اپنے مہماں کے لئے   وقف کرتے تھے گھر اپنا اپنے مہماں کے لئے

تھا یہی شیوہ ہمارا۔ اپنے مہماں کے لئے   رکھتے تھے بچوں کو بھوکا اپنے مہماں کے لئے

خرچ سے گھر کے سوا۔ کھانا جہاں ہوتا نہ تھا

قوم میں ہوتے تھے جو محتاج یا مفلس ذرا   جو تونگر تھے وہ اُن کی کرتے تھے حاجت روا

میزباں تھے اپنے مہماں پر بجان و دل فدا   تھا مسافر کے لئے اک ایک گھر مہماں سرا

ہمکو کچھ غربت میں فکرِ آب و ناں ہوتا نہ تھا

تھے سخاوت کو ہم اک قومی علامت جانتے   میہماں داری کو تھے اک بڑھتی دولت جانتے

شکر نعمت کو بھی تھے ہم ایک نعمت جانتے   میہمانوں کو تھے اپنے گھر کی برکت جانتے

ٹھیرنا مہمان کا برسوں گراں ہوتا نہ تھا

اپنے ہمسایوں پہ ہم کرتے تھے شفقت جاوداں   جانتے تھے ہم اُسے فضلِ الٰہی کا نشاں

تھی مروت میں ہماری قوم مشہورِ جہاں جانتے تھے ہم کہ ہے اس پر خدا نا مہرباں

جو کہ ہمسایہ پہ اپنے مہرباں ہوتا نہ تھا

اُن کی خاطر ہم لُٹا دیتے تھے اپنا مال و زر کرتے تھے غمخواریاں۔ ہوتا تھا کوئی غم اگر

جھیلتے تھے زحمتیں ہم اُن کے بدلے وقت پر ہم ہر اک آفت میں ہمسایوں کے رہتے تھے سپر

دشمنوں سے اپنے انکو خوفِ جاں ہوتا نہ تھا

تھے شریکِ شادی و غم اُن کے ہم صبح و مسا کرتے تھے اظہارِ احساں کا نہ اُن پر بر ملا

کرتے تھے ہمسایہ کی غمخواریوں کا حق ادا چپکے چپکے حاجتیں کرتے تھے سب اُن کی روا

فقر و فاقہ اُن کا خلقت پر عیاں ہوتا نہ تھا

پہلے سنتے تھے نہ یہ اوصاف اپنی قوم کے ہم میں ایسے بیمروت سنگدل ہوتے نہ تھے

تب ہماری عیش میں اور اُن کی شادی میں کٹے پیٹ بھر لیں اپنا۔ اور ہمسایہ فاقہ سے رہے

اتفاق آگے یہ لے ہندوستاں ہوتا نہ تھا

یوں نہ ہمجنسوں سے کرتی تھیں یہ آنکھیں جی ریاں تو نے اپنی سی سکھا دیں ہم کو نہ ہا خوریاں

بندِ نہم

جن سے اظہار اپنی الفت کا ذرا کرتے تھے ہم اُن سے سچی یاریوں کا حق ادا کرتے تھے ہم

صاف تھا جو کچھ محبت یا گلا کرتے تھے ہم جس سے کرتے تھے محبت بے ریا کرتے تھے ہم

جس کی ہوتی تھی شکایت برملا کرتے تھے ہم

راہِ اُلفت میں کسی کا گر پھسلجاتا قدم
روکدیتے تھے ہم اُس کو برملا کہہ کر کہ تھم

کرتے تھے احباب کی تعریف پنہاں دمبدم
شکوہ ہوتا تھا تو اکثر مُنہ پہ کہدیتے تھے ہم

شکر کرتے تھے تو غیبت میں سوا کرتے تھے ہم

دوستی کی ہم کیا کرتے تھے جن سے رسم وراہ
تھی شب و روز اُن کی بیجی دوستداری پر نگاہ

تھے سفر میں اور حضر میں اُن کے سچے خیر خواہ
دوست بنجاتے تھے جنکے اُن سے کرتے تھے نباہ

عہد کرتے تھے تو عہدوں کو وفا کرتے تھے ہم

دوستوں کا ہم نہ کچھ اپنوں سے کم دیتے تھے ساتھ
عُسرت و عشرت میں اُن کا ہر قدم دیتے تھے ساتھ

بزم شادی ہو کہ ہوں آثارِ غم دیتے تھے ساتھ
جنکے ہو جاتے تھے ساتھی اُنکا ہم دیتے تھے ساتھ

رنج و راحت میں شریک اُنکے رہا کرتے تھے ہم

کوئی بیماری اگر ہوتی تھی اُن کو دل خراش
کرتے پھرتے تھے طبیب اُنکے لئے ہر جا تلاش

ہوتے تھے رقت سے دل حالت پہ اُنکی پاش پاش
کرتے تھے عُسرت میں اُن کے واسطے فکر معاش

اُن کی بیماری میں تدبیر اور دوا کرتے تھے ہم

دوسروں کے واسطے عیش و طرب دیتے تھے چھوڑ
روز کے کام ہمیں ہم اور خواب شب دیتے تھے چھوڑ

اُن کی خاطر ہم خیال اپنوں کا جب دیتے تھے چھوڑ
کام میں یاروں کے اپنے کام سب دیتے تھے چھوڑ

ہمیں روزے اور نمازیں تک قضا کرتے تھے ہم

کھیل قسمت سے کوئی بنکر بگڑ جاتا تھا جب　　رنگ جمکر بزم شادی کا اُکھڑ جاتا تھا جب

پھر ہم اُلفت قضا سے زرد پڑ جاتا تھا جب　　یار کوئی مر کے اپنوں سے بچھڑ جاتا تھا جب

یار کی اولاد پر جانیں فدا کرتے تھے ہم

خاندانی جن سے ہوتی تھی رہ و رسم و وداد　　جن کی اگلی اُلفتوں کے ہوتے افسانے تھے یاد

اُن پہ کرتے تھے فدا ہم اپنی جانیں ہوکے شاد　　سُنتے تھے اپنے بڑوں کا جبکہ پیار اور اتحاد

اُنکی نسلوں سے وہی رسمیں ادا کرتے تھے ہم

ہوگئے تھے بے گماں اپنے یگانے ہم کو دوست　　جانتے تھے میداں میں دشمن سے بچانے ہمکو دوست

موت کے منہ میں بھی دیتے تھو نہ جانے ہمکو دوست　　دشمنوں کی زد میں دیتے تھے نہ آنے ہمکو دوست

ٹوک دیتے تھے ہمیں جب کچھ خطا کرتے تھے ہم

ہم میں جاری تھی رہ و رسم محبت صبح و شام　　تھے فدا آپس میں ہم اک دوسرے پر خاص و عام

تھے طریقے ہم میں سچے دوستوں کیسے تمام　　آج وہ کام آتے اپنے کل ہم اُن کے آئے کام

بارہا باہم سلوک ایسا کیا کرتے تھے ہم

تو نے اے ہندوستاں کھو دیں کہاں وہ یاریاں

یاریاں باقی رہیں ہم میں نہ وہ غمخواریاں

بند دہم

قوم کے اجزا تھے جبتک اپنی حالت میں بہم ٹوٹتا تھا اپنی جمعیت پہ کوئی قہر کم
اُڑ گئی نا اتفاقی - سے وہ برکت یک قلم تیرے سایہ سے رہے اے ہند جبتک دور ہم
اپنی یکرنگی رہی ضرب المثل بین الاُمم

سینکڑوں دریا سمندر میں ہمارے مل گئے جنکے منبع کا نشاں ملتا نہیں۔ گر ڈھونڈیئے
ایک ملت بن گئی قوموں - کے مل کر تفرقے مل گیا جو ہم میں آکر۔ پھر نہ تھے ہم پوچھتے
روم ہے یا ترک ارمن ہے عرب ہے یا عجم

عجمی و تازی و زنگی میں نہ تھی باقی تمیز قوم میں تہذیب نے بالکل نہ رکھی تھی تمیز
اک چمن کے پھول تھے سب اُنمیں کیا ہوتی تمیز ملتِ بیضا نے قوموں کی مٹادی تھی تمیز
تھے بلالؓ و جعفرؓ و سلمانؓ برابر محترم

لشکرِ اسلام میں غازی جو تھے ہر قوم کے سب کی وضعیں ایک تھیں اور سب کے یکساں روپ تھے
لڑتے تھے دشمن سے اپنے ایک ہی انداز سے ایک رنگت میں اخوت کے تھے سب رنگے ہوئے
اسود و احمر جو تھے اسلام کے زیرِ علم

جتنی قومیں تھیں عراق و ارمن و توران کی جتنی نسلیں تھیں حجاز و چین و زابل میں بسی
ترکی و مصری و ہندی، رومی و شامی سبھی زنگی و خوارزمی و تاتاری و مازندری

ایک دسترخوان پر کھاتے تھے سب مل کر بہم

خانہ جنگی سے اگر آپس میں لڑتے تھے اِدھر　　تن کے ہم سرحد پہ دشمن۔ جاکے لڑتے تھے اُدھر

وقت پر تھے صلح کر لیتے۔ بگڑتے تھے اگر　　گو سدا آپس میں لڑتے اور جھگڑتے تھے مگر

وقت جب پڑتا تھا۔ آکر ایک ہو جاتے تھے ہم

جب حقوق ادنیٰ و اعلیٰ سب کو تھے یکساں ملے　　ایک میزانِ عدالت میں تھے سب تُل کر چکے

فیض پاتا تھا برابر ہر بشر اسلام سے　　فرق رکھا تھا کہ و مہ میں نہ کچھ اسلام نے

تھے برابر نفقہ و کسوت میں آقا اور خدم

تھا اصول سلطنت میں راز قدرت کا چھپا　　ہے خلافت ہی سے جمہوری حکومت کی بنا

فرق بالکل حاکم و محکوم میں اصلا نہ تھا　　حق خلیفہ کا نہ تھا اس میں رعیت سے سوا

جمع بیت المال میں ہوتی تھی جو آکر رقم

دیتے تھے محفل میں آزادی سے رائیں خاص و عام　　بحث میں انصاف سے ہوتے تھے باہم ہمکلام

صاف حق گویوں کی شمشیر زباں تھی بے نیام　　ٹوک دیتا تھا سر دربار بڑھ کر اک غلام

گر کہیں بے راہ اُٹھ جاتا تھا حاکم کا قدم

طاعت رب کے سوا طاعت نہ تھی کوئی پسند　　محبت حق کے سوا محبت نہ تھی کوئی پسند

قوت دل کے سوا قوت نہ تھی کوئی پسند　　شوکت دیں کے سوا شوکت نہ تھی کوئی پسند

ملکِ جم لیکر نہ پاس آتا تھا اپنے کبرِ جم

صحبتوں میں تکیہ و مسند کا آئیں کچھ نہ تھا — مجلسوں میں امتیازِ صدر و پائیں کچھ نہ تھا

بندِ یازدہم

تھے ہماری قوم کے پیر و جواں روشن ضمیر — تھا بنا صدق و صفا سے اُن بزرگوں کا خمیر

ہم میں جو کرتا تھا بدعہدی۔ وہ ہوتا تھا حقیر — راستبازی میں ہماری لوگ دیتے تھے نظیر

فرد تھے پاسِ سخن میں قوم کے برنا و پیر

تھا ہمارے صدق پر اوّل سے سب کو اعتقاد — عہد جو اپنے سلف کے تھے، رہا کرتے تھے یاد

سچ تو یوں ہے راستبازی تھی ہماری خانہ زاد — دوست دشمن کو ہمارے قول پر تھا اعتماد

دے چکے جب ہم زباں۔ پھر تھی وہ پتھر کی لکیر

رات دن رہتی تھی ہم میں صلح بھی پرخاش بھی — تھے تونگر بھی غنی بھی مفلس و قلاش بھی

نیک تھے ہم میں تقی بھی، رند بھی عیاش بھی — تھے ثقہ بھی ہم میں بد اطوار بھی اوباش بھی

تھا سخن کا اپنے لیکن پاس سب کو ناگزیر

لشکرِ اسلام جب ہر بحر و بر پر چھا گئے — ہند سے تا اندلس تسخیر کے پرچم کھلے

راستی قوموں نے سیکھی اپنی صلح و جنگ سے — کوئی بدعہدی سے تھا بڑھکر نہ عیب اُن کیلئے

حق جنھیں کرتا تھا ہم میں وارثِ تاج و سریر

ہر کس وناکس کو اپنی راست گوئی پر تھا ناز　　تھا ہمارے نیک و بد میں ایک قومی امتیاز
چور بھی کرتے تھے کجبازی سے ہم میں احتراز　　جیسے رہزن اور لٹیرے تھے ہمارے راستباز
پاسبانوں میں نہیں پاتے ہم آج اُن کی نظیر

فعل ہو بر عکس قول۔ آگے یہ کیفیت نہ تھی　　عہد بندھ کر ٹوٹ جائے۔ پہلے یہ نیّت نہ تھی
پہلے قلبوں کی ہوئی یہ قلب ماہیت نہ تھی　　دل میں کچھ ہو اور زباں پر کچھ۔ یہ خاصیت نہ تھی
خاک میں اس سرزمیں کی جس سے تھا اپنا خمیر

ہم میں سے تھے روشن ضمیر۔ اور ہم میں اخوان الصفا　　ظاہر و باطن ہمارا صورت آئینہ تھا
تھی ہماری رزم و بزم آئینۂ بغض و وفا　　جنگ تھی تو بر ملا تھی۔ صلح تھی تو بے ریا
ہمکو زہر آتا نہ تھا دینا۔ بنا کر جام شیر

بات جو ہونی تھی کر لی۔ لب پہ لاتے تھے وہی　　جو ارادہ دل میں ہوتا تھا۔ بتاتے تھے وہی
کرتے تھے پاس سخن جو سبکو بھاتے تھے وہی　　منہ سے جو کہہ بیٹھتے تھے کر دکھاتے تھے وہی
ہے گرج کر پھر برستا جس طرح ابر مطیر

جاں بکف ہم منہ پہ خونخواروں کے کہہ آتے تھے حق　　جا کے جباروں کے درباروں میں کہہ آتے تھے حق
ہم بھرے جلسوں میں کفاروں کے کہہ آتے تھے حق　　چھاؤں میں ہم جا کے تلواروں کی کہہ آتے تھے حق
غالب آتا تھا نہ ہم پر خوف سلطان و امیر

تھے ہمیں پر تو نے ظلم و ستم کیا کیا تجھے　　بے مروت تجھکو پایا قول کا جھوٹا تجھے

یاد ہوگا قصہ صدق و صفا اپنا تجھے　　پر بنایا جب سے ہم نے ملجأ و ماویٰ تجھے

راستبازی ہوگئی اے ہند ہم سے گوشہ گیر

کردیئے تو نے تمام اسلام کے ارکان سست　　ہوگئے بودے ہمارے عہد اور پیمان سست

بند دوازدہم

تھے ہماری قوم میں شائستگی کے جو خیال　　تھی نمونہ اہلِ دنیا کے لئے وہ چال ڈھال

تھی ہمارے زندہ دل ہونے کی یہ ادنیٰ مثال　　شرق سے تا غرب جب عالم میں تھا قحط الرجال

تھی ہماری قوم میں ارزانیٔ اہلِ کمال

ہم نے یورپ کیلئے کھولی تھی علم و فن کی راہ　　ہو رہا تھا ابرِ ظلمت سے جب اُس کا دن سیاہ

اہلِ مغرب نے ہمیں سے پائی علمی دستگاہ　　علم و حکمت نے ہماری آن کر لی تھی پناہ

روم اور یونان پر جب چھا گیا جہل و ضلال

فلسفہ تاریخ یا علمِ ادب یا علمِ دیں　　تھیں بہت کچھ یں کہ انمیں تھیں ہماری خوشہ چیں

علم کی دولت نے تھا ہم کو کیا بالانشیں　　جاہلوں کا تھا ہماری قوم میں گھاٹا نہیں

جیسے اب لکھے پڑھے ملتے ہیں ہم میں خال خال

علم کی برکت سے ہم پر کھل گئے چودہ طبق　　مصر و یوناں کے مناظر ہم سے لیتے تھے سبق

بحث کرتے تھے ہم اُن پر تھے جو مضمونِ دِق — منع۔ استدلال۔ یا توجیہ۔ یا تحقیقِ حق

تھی یہی اکثر ہماری مجلسوں میں قیل و قال

علم نے تھی جان ڈالی۔ قوم کے آداب میں — اِک یہی گُر تھا ترقی کے تمام اسباب میں

وہ کرشمے تھے عیاں۔ دیکھے نہ تھے جو خواب میں — ترک میں وحشت ہی تھی اور نہ جہل اعراب میں

دینِ بیضا نے دیا تھا آکے کانٹا سا نکال

علم سایہ میں عَلَم کے تھا جو ہر دم ساتھ ساتھ — ہر جگہ تیغ و قلم رہتے تھے باہم ساتھ ساتھ

فتح جن ملکوں کو ہم کرتے تھے پیہم ساتھ ساتھ — علم بھی جاتا تھا۔ جاتے تھے جہاں ہم ساتھ ساتھ

علم نے اسلام سے باندھا تھا پیمانِ وصال

بادشا پاتے تھے خیل و حشم میراث میں — جنگجویوں کو ملا سیف و عَلَم میراث میں

علم سب پاتے تھے لیکن یک قلم میراث میں — سیم و زر ہم چھوڑ کر جاتے تھے کم میراث میں

تھی کتاب اپنی بضاعت اور ادب تھا اپنا مال

ہم سے برتر تھی نہ کوئی قوم عز و جاہ میں — اور ہمارا علم و فن مشہور تھا افواہ میں

تھیں مہذب عادتیں ایسی گدا و شاہ میں — خلق کرتی تھی ہماری ریس رسم و راہ میں

کر دیا تھا علم نے سب کے لئے ہم کو مثال

تھی ہمارے علم و فن سے رشکِ یونان بزمِ دہر — تھی ہماری روشنی سے اختر ستاں بزمِ دہر

آج جس کوشش کی ہے ممنون احساں بزمِ دہر　　آج جس علم و ہنر سے ہے چراغاں بزمِ دہر

ہمنے بنیاد اُس کی دی تھی پیشتر دُنیا میں ڈال

تھا ہمارے پاس شمشیر و سناں فضل و ہنر　　تھا ہماری قوم میں کشور ستاں فضل و ہنر

تھا ہمارے پاس گنج شائگاں فضل و ہنر　　تھی ہماری دولت اے ہندوستاں فضل و ہنر

آگیا تیری بدولت اپنی دولت کو زوال

ہمکو ہر جوہر سے یوں بالکل معرا کر دیا　　تونے اے آب و ہوائے ہند یہ کیا کر دیا

بندِ سیزدہم

ہمنے یہ مانا کہ جب لُوٹا گیا ہو کارواں　　نامناسب ہو کریں گر اگلی دولت کا بیاں

جب پلٹ جانے زمانہ ہے عبث شور و فغاں　　ہمنے یہ مانا کہ جب گلشن میں ہو فصل خزاں

بے محل ہے چھیڑنی واں عہدِ گل کی داستاں

رنگ ہو بگڑا ہوا جب قوم کے اطوار کا　　فائدہ کیا اگلے حُسن خلق کے اظہار کا

ہو ستارا ڈوبتا جب طالع بیسلہ کا　　ہو فلک پر ابر جب چھایا ہوا ادبار کا

پھر سلف کی شان و شوکت کیجے کس منہ سے بیاں

پہنچی تھی یورپ تلک اپنے علم و فن کی روشنی　　پا بہت قوموں نے لی اسلام سے شائستگی

قوم کا ہی دل دکھانا کرے یہ ذکر جلی　　ہیں یہ باتیں بھولجانے کی مگر کیونکر کوئی

بھولجائے رات کا سب صبح ہوتے ہی سماں

درد سے محرم ہوئے مدت نہیں گذری بہت — اور جو شاد و خرم ہوئے مدت نہیں گذری بہت

عیش کو ماتم ہوئے مدت نہیں گذری بہت — بزم کو برہم ہوئے مدت نہیں گذری بہت

اُٹھ رہا ہے گُل سے شمع بزم کے اب تک دھواں

اُڑ رہی ہے گرد سوئے آسماں اے خاک ہند — سُنتے ہیں کچھ جو برس کی داستاں اے خاک ہند

ہے اُداسی کا جو یوں چھایا سماں اے خاک ہند — گذرے ہیں یاں نقش پائے رہرواں اے خاک ہند

یاں سے گذرا ہے ابھی اِک باتجمل کارواں

بھولجائیں کیونکر اپنی قوم کا عز و شرف — ہم ہیں کچھ غیرت سے عاری تو نہ ہوں اس نے انصاف

گو رہیں گے ہم بہت دن تک بلاؤں کے ہدف — گو یقیں ہے رفتہ رفتہ یاد ایام سلف

دل سے چھوٹیگی مٹا کر گردشِ دورِ زماں

آئی جب فصل خزاں باغ عرب کو تاک کر — پہلی آب و تاب کا پھر دیں پہ کیا پائیں اثر

ہو چلے ہیں اس چمن کے رنگ و بو سے بیخبر — بھولجائیں گے کہ تھے کن ڈالیوں کے ہم ثمر

ٹوٹ کر آئے کہاں سے اور بکھے آ کر کہاں

گو خدائے علم سے ہے انقلاب روزگار — ہے ترقی و تنزل کا اُسی کو اختیار

عہدِ آدم سے یونہی ہے گردش لیل و نہار — پر زمانہ میں رہیں گے تا قیامت یادگار

جو کئے برتاؤ تو نے ہم سے اے ہندوستاں

ہوگی بیداری۔ ہماری غفلت۔ اوروں کے لئے
تازیانہ ہوگی۔ اپنی نکبت۔ اوروں کے لئے

رہنما ہوگی ہماری حالت۔ اوروں کے لئے
ماجرا ہوگا ہمارا عبرت۔ اوروں کے لئے

چیت جائیں گے بہت سنکر ہماری داستاں

رہتے مجنونوں سے ہیں جیسے اطبا دور دور
بھیڑیئے سے جیسے پھرتا ہے گڈریا دور دور

شیر کا جسطرح کرتے ہیں تماشا دور دور
سانپ سے جسطرح رہتا ہے سپیرا دور دور

حکمراں تیرے یونہی تجھ سے رہیں گے برکراں

برکتیں یاں چھوڑکر ہم اپنی جائیں گے بہت
ہم نہ ہوں گے۔ پر نصیحت ہم سے پائیں گے بہت

مَولُودِ بہاریّہ

یہ مولود مولانا وحید الدین سلیم نے جوانی میں لکھا تھا۔ اس وقت وہ مفتوں تخلص کرتے تھے۔ جسے انھوں نے بعد میں سلیم سے بدل لیا۔ میں نہایت ممنون ہوں جناب صوفی عبدالخالق صاحب پانی پتی کا جنھوں نے مہربانی فرماکر یہ مولود جو آجکل بالکل نایاب اور عنقا ہے، مجھے اس مجموعہ میں شامل کرنے کے لئے مرحمت فرمایا۔ اُن کے پاس یہ مولود مطبوعہ تھا۔

اس عجیب وغریب نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش موسم بہار میں ہوئی تھی۔ لہذا اس مولود میں بھی موسم بہار سے تعلق رکھنے والے تمام پھولوں اور پودوں کے نام اور وہ تمام اشیاء جو موسم بہار سے مناسبت رکھتی ہیں، نہایت خوبی اور روانی کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ ادب لطیف کے شائق اس مولود کو امید ہے کہ نہایت دلچسپ پائیں گے۔

(اسماعیل)

اے ہمدمِ شیریں سخن ہے نورِ حق پرتو فگن ہر نخل اس کی ہے پھبن طورِ جمالِ ذوالمنن

بن ٹھن عروسانِ چمن شیریں ادا نسریں بدن رنگیں قبا گل پیرہن ہیں کس مزے سے خندہ زن

ہر گل میں ہے تابِ ضیا ہر دل میں ہے نورِ صفا ہر نخل ہے سروِ رسا ہر برگ ہے دستِ حنا

ہر غنچہ ہے گلگوں قبا ہر شاخ زلفِ مشک سا ہر لالہ ہے رنگیں ادا ہر سمت نسریں نسترن

سنبل جو زلفِ حور ہے گل ساغرِ بلور ہے جو خوشۂ انگور ہے گویا شرابِ طور ہے

نرگس عجب مخمور ہے کیا حسن پر مغرور ہے تن میں قبائے نور ہے جس پر نرالی ہے پھبن

شاخِ چمن ہے گل فشاں کانِ عدن ہے گلستاں مرغِ چمن ہے نغمہ خواں دشتِ ختن ہے بوستاں

لعلِ یمن ہے ارغواں قلبِ چمن ہے شادماں گرمِ سخن ہیں ہر زماں ہائے نغمہ پیرا مرد و زن

گل ساغرِ رنگیں بنا گل دامنِ گلچیں بنا گل غنچۂ قالیں بنا گل خوشۂ پرویں بنا

گل لالہ و نسریں بنا گل روئے حورالعیں بنا گل گیسوئے مشکیں بنا دیکھو تو شوخی کا چلن

سبزہ جو ہے عنبر فشاں ہے آتشِ گل کا دھواں گل سے بھری ہے گلستاں یا جوہری کی ہے دکاں

سوسن برنگِ بستاں دیتا ہے نیلم کا نشاں لالہ ہے یا لعلِ بتاں شبنم ہے یا دُرِ عدن

سبزہ چمن میں ہے اُگا فرشِ زمرد ہے بچھا ہے یا من گوہر نما یا جام ہے الماس کا

یاقوت ہے برگِ حنا ہے شاخِ گل مرجاں صفا مثلِ عقیق ہے بے بہا رنگیں قبا ہے نارون

چنپا ادا سے ہو کے خم چپ ہو رہا ہے یہ ستم کھولا نہ خوں میں دل کا غم بدلا نہ بادِ درد و الم

پہ ہے چٹکتی دمبدم   اس کے ثبوت یہ قلم   نعت رسولِ محترم   ملّت شہنشاہ زمن

نرگس بھی کیا حیران ہو ؟   کس حسن پر قربان ہو ؟   کس جلوہ کا یہ دھیان ہے ؟   کس نور کا ارمان ہے ؟

خاموش اور گریان ہو   بیہوش اور بیجان ہو   کیا قدرتِ جانان ہو   اللہ رے شانِ ذوالمنن

ہر ایک پاسے ہی کھڑا   کس درجہ ہے شرم و حیا   خاموش ہے سر کو جھکا   پھر تجھ سے کوئی کیا

جب لگ چلی بادِ صبا   پتوں نے یہ کھولا پتا   کہتا ہے یہ صلِّ علیٰ   اے مرحبا اکبر زمن

سوسن ہو گرچہ دہ زباں   پر کیا ادا ہو اس سے ہاں   نعتِ رسولِ انس و جاں   ہے دل سے اسکے بیاں

ہے وہ بھی اک غنچہ دہاں   خاموش ہو مثلِ بتاں   ہے دل میں رازِ غم نہاں   حیران ہو اور غنچہ دہن

لالہ جو ہے خونی جگر   ہے خرمنِ جاں میں شرر   لب پر نہیں آتا مگر   جو غم ہے دل میں مستتر

پنہاں جو ہے اک شور و شر   ہے الفتِ خیر البشر   عشقِ رسولِ بحر و بر   ہے اس سبب خونیں کفن

گیندا ہوا ہے زرد رو   تکتا ہے ہر دم چار سو   کیا جانے کیا ہے جستجو   کس جلوہ کی ہے آرزو

ہے مثلِ سنبل موبمو   آشفتہ دل آشفتہ خو   آتا نہیں لب پر کبھو   رازِ نہاں کا کچھ سخن

ہے موتیا گوہر فشاں   اور کیتکی ہے تر زباں   سنبل ہے زلفِ مہوشاں   گیندا ہے روئے عاشقاں

نرگس ہے چشمِ بستاں   زنبق کھلا ہے خستہ جاں   شبو ہے زیبِ گلستاں   لالہ ہے شمعِ انجمن

سوسن ہے بانگیں ادا   اور نازبو رنگیں قبا   سورج مکھی روشن ہوا   چنپا میں ہے کیسی حیا

ہے یاسمن میں کیا صفا   نسرین میں ہے کیسی ضیا   ہے ناردن بھی دلکشا   عباس ہے گل پیرہن

بلبل جو شاہد باز ہے ہر دم نوا پرداز ہے ہر گل سراپا ناز ہے مجنوں دلبر طناز ہے
کیا عشوہ کیا انداز ہے کیا غمزہ کیا اعجاز ہے کیا حسن کا آغاز ہے دیکھو نرالا بانکپن
عالم میں کیا تنویر ہے کیا نور کی تاثیر ہے کیا جلوہ عالمگیر ہے حیرت سے گل تصویر ہے
ہر گل زمیں کشمیر ہے جو تاک و بید انجیر ہے طوبیٰ کا دامن گیر ہے سدرہ پہ ہے پرتو فگن
ہیں بلبل و گل بھو گر، فرطِ خوشی سے نغمہ گر، اور سرو و قمری جھوم کر، کرتے ہیں ہر دم شور و شر
طاؤس و گلبن بے خبر ہیں وجد میں شام و سحر فرحت کا یاں تک ہے اثر ہے آسماں بھی چرخ زن
جو لالہ خوش رنگ ہے دیکھو اسی کو ہی دنگ ہے جو یاسمن کا ڈھنگ ہے وہ مست خوش آہنگ ہے
جس جا گلِ اورنگ ہے واں نقشہ ارژنگ ہے آئینہ نیرنگ ہے یا ہے گلستانِ عدن
قمری ہے یا قوال ہے گلبن کو وجد و حال ہے خوش خوش صبا کی چال ہے سبزہ ہوا پامال ہے
پتوں کی جنبش تال ہے بلبل کا یہ احوال ہے منقار خوں سے لال ہے نغموں سے ہے آتش فگن
نشو و نما کا ہے عمل پھولے ہیں پا تک پھول پھل گلشن کے غنچے ہیں مثل آئیں جو طوبیٰ سے نکل
جنت کی حوریں بے بدل غنچہ دہاں ہیں لعل شرمندہ ہوا ریحان بل پھر خموشی سے دہن
لیکن زمیں سے تا فلک پھولوں کی پھیلی ہے مہک جس سے معطر ہیں فلک اور رنگتیں حوریں چمک
ہے برقِ عشرت کی جھلک یا نورِ گلشن کی چمک جاتی ہے چشمِ دل جھپک ہوتے ہیں جب گل خندہ زن
سرسبز کیا گلزار ہے جنت ہے یا فرخار ہے نسریں جو عنبر بار ہے ہر اک چمن تاتار ہے
ہر اک روش گلنار ہے سنبل عجب دلدار ہے گیسو کا ہر تار ہے مہرِ درخشاں کی کرن

دیکھو تو اے اہل صفا کیا جلوہ ہے حیرت نما شوخی سے ہر برگ حنا ہے دست رنگیں بن گیا
ہے بیر لبالب سے دھرا جام مئے ناز و ادا پی کر یہ جام جانفزا خوں ہو گیا ہے اسکا من
گل حور ہے یا ہے پری ہے نازنیں جاں پروری انداز میں جلوہ گری اللہ رے شان دلبری
کچھ حسن سے ہے خود سری ہے مہ سے اس کو ہمسری کرتا ہے مہر خاوری قربان اُس پر جان تن
ہے چار سو شور طرب کافور ہے رنج و تعب دل میں صفائی ہے عجب آئینہ عشرت ہے سب
ہے نغمۂ شادی بلب ہیں دست بستہ با ادب سر کو جھکائے ہیں سب لانے میں یہ لب پر سخن
پھیلا یہ کیسا نور ہے عالم جو مثل طور ہے کس جلوہ سے معمور ہے ہر دل جو اب مسرور ہے
وہ کون رشک حور ہے جس کا یہ ہر دم شور ہے جو خستہ و رنجور ہے اسکے سبب ہے خندہ زن
وہ وقت ہے اب ہمنشیں نازاں فلک پر ہے زمیں شاداں ہیں سب اہل حزیں ہر باغ ہے خلد بریں
ہر پھول ہے ماہ جبیں سنبل ہے زلف حوریں شبنم ہے یا دُر ثمیں لالہ ہے یا لعل یمن
وہ وقت ہے اب دلکشا ہے نور حق جلوہ نما ہے سرو تا اوج سما پانے لگا نشو و نما
جنت سے کیا موج صبا لائی نسیم جاں فزا ہیں غنچہ و گل عطر سا ہوں نافۂ مشک ختن
وہ وقت ہے اب جلوہ گر وہ جلوہ آتا ہے نظر جسکو ملائک دیکھکر ہیں آسماں پر بے خبر
اور طور پر ہے یہ اثر جلکر بنا مشت شرر موسیٰ بھی غش میں غرق تر یوسف بھی ہے شیون فگن
وہ وقت ہے بے رنج و غم ہیں وجد میں لوح و قلم سجدہ لگا کرنے حرم ہے جوش عشرت دمبدم

وا ہے در باغ ارم ہر سمت عالم ہے بہم رکھتے ہیں اپنے سر کو خم حسن و ادب سے ہو مفتون

کیا شوخیِ دلدار ہے کیا جلوۂ رخسار ہے کیا غیرتِ دیدار ہے کیا لذتِ گفتار ہے

کیا مستیِ رفتار ہے کیا طرۂ دستار ہے کیا سرخیِ گلنار ہے ہو زیب سر جیسے پھبن

ہے ساز میں دلکش نوا برپا ہیں شادی کی صدا اور ہر ایک کہتا ہے جدا صلِ علیٰ صلِ علیٰ

حور و ملک ارض و سما روز و شب صبح و مسا کہتے ہیں سب ہو مرحبا لئے طرب بار و سمن

ہے صاف جامِ لالہ گوں شاداں ہے مینا کا خوں کوثر کو لذت بخش دوں اس بادہ کو کیونکر کہوں

اس کا نشہ ہے پر فسوں یا مستیِ شورِ جنوں کہتا ہے یہ شوقِ دروں لا ساقیا سیمیں بدن

وہ دم کہ جس سے ہو عیاں سب حسن کے راز نہاں اور عشق کا شور و فغاں پیدا ہوئے کام و زباں

تا دیکھ کر حسن بتاں یاد آئے اس شہر کی شاں جیسے سب کے ایماں پیدا ہوئے یثرب وطن

گلزار کے گلنار میں گلنار کے رخسار میں رخسار کے انوار میں انوار کے دیدار میں

دیدار کے اسرار میں اسرار کے آثار میں آثار کے اظہار میں ظاہر ہوئی شانِ ذوالمنن

ہیں تشنۂ شوقِ لقا ہیں خضر ذوقِ ادا ہیں طالبِ حسن صفا ہیں زخمیِ تیغِ قضا

خضر بھی ہم آبِ بقا اور یوسفِ حسن آشنا اور موسیٰ حیرت نما اور عاشقانِ نعرہ زن

برقِ تجلی ہر زماں ہے کوندتی بر آسماں روشن ہے نورِ حق سے جاں قدسی ہیں باہم شادماں

جبریل ہیں تسبیح خواں دیتے بشارت ہیں یہاں مل کر کروبی روحانیاں شادی کی برپا انجمن

ہے نورِ وحدت جلوہ گر روشن کرو اپنی نظر اہلِ زمیں کو دو خبر ہو شادماں تا ہر بشر
پھر وجد میں شام و سحر جن و بشر شاخ و شجر نور و ملک شمس و قمر ہوں مطربِ حسی نغمہ زن
نورِ قدم تھا پیدا ہوا شاہِ امم پیدا ہوا عرشی قدم پیدا ہوا والا حشم پیدا ہوا
فرخ شیم پیدا ہوا بحرِ کرم پیدا ہوا کوہِ ہمم پیدا ہوا پیدا ہوا قدسی سخن
یاسیں لقب پیدا ہوا مقبولِ رب پیدا ہوا مہرِ عرب پیدا ہوا ہاشم نسب پیدا ہوا
فخرِ عرب پیدا ہوا کنزِ طرب پیدا ہوا غفراں طلب پیدا ہوا پیدا ہوا شیریں دہن
شاہِ جہاں پیدا ہوا محبوبِ جاں پیدا ہوا زیبِ جناں پیدا ہوا تاجِ شہاں پیدا ہوا
عذب البیاں پیدا ہوا رطب اللساں پیدا ہوا عرشی مکاں پیدا ہوا پیدا ہوا مشکیں بدن
گردوں لوا پیدا ہوا کشور کشا پیدا ہوا ظلِ خدا پیدا ہوا یوسف لقا پیدا ہوا
بدعت رُبا پیدا ہوا وحدت نما پیدا ہوا عزت فزا پیدا ہوا پیدا ہوا عزّیٰ فگن
ماہِ مبیں پیدا ہوا مہرِ زریں پیدا ہوا رکنِ متیں پیدا ہوا عیسیٰ دیں پیدا ہوا
رفرف نشیں پیدا ہوا رحمت گزیں پیدا ہوا ایسا حسیں پیدا ہوا شیدا ہیں جس پر مرد و زن
ظلِ احد پیدا ہوا نورِ صمد پیدا ہوا فیضِ ابد پیدا ہوا غیبی مدد پیدا ہوا
کیا مستند پیدا ہوا محکم سند پیدا ہوا آبِ ہر بلد پیدا ہوا آوازہ شاہِ زمن
خیر البشر پیدا ہوا نورِ نظر پیدا ہوا عین البصر پیدا ہوا رشکِ قمر پیدا ہوا

صاحب خیر پیدا ہوا نیکو سیر پیدا ہوا وہ پیمبر پیدا ہوا جسکی نرالی ہے پھبن

نور ازل پیدا ہوا حسنِ عمل پیدا ہوا نسخ ملل پیدا ہوا دفع خلل پیدا ہوا

عالی محل پیدا ہوا فخر اوّل پیدا ہوا ہاں بے بدل پیدا ہوا صدقے ہیں جسپر جان و تن

ختم رسل پیدا ہوا شمع سبل پیدا ہوا اظہار کل پیدا ہوا شایان قل پیدا ہوا

فخر رسل پیدا ہوا وہ رشکِ گل پیدا ہوا جس کا یہ غل پیدا ہوا عالم میں تا چرخ کہن

ماہِ نکو پیدا ہوا خورشید رو پیدا ہوا محمود خو پیدا ہوا خوش گفتگو پیدا ہوا

صافی گلو پیدا ہوا کیا مشکبو پیدا ہوا مشکینہ مو پیدا ہوا عالم ہوا رشکِ ختن

شاہِ زمن پیدا ہوا یثرب وطن پیدا ہوا نسریں بدن پیدا ہوا گل پیرہن پیدا ہوا

شیریں دہن پیدا ہوا سیمیں ذقن پیدا ہوا وہ بت شکن پیدا ہوا ہے جسمیں نورِ ذوالمنن

وہ باعثِ ایجادِ جہاں وہ مظہرِ سترِ نہاں وہ مردمِ عینِ عیاں وہ خسروِ کون و مکاں

وہ پیشوائے مرسلاں وہ شافعِ ہر این و آں وہ حامیٔ درماندگاں وہ قبلہ گاہِ جان و تن

وہ مطلعِ نورِ قدم وہ مشرقِ مہرِ کرم وہ مصدرِ فیضِ اتم وہ مظہرِ حسنِ شیم

وہ مخزنِ جود و ہمم وہ مقصدِ فخرِ امم وہ مطلبِ عز حرم وہ نامنِ ہر ما و من

وہ عاشقِ فرمانِ رب وہ طالبِ حسنِ طلب وہ عالمِ امی لقب وہ خسروِ والا حسب

وہ دلبرِ عالی نسب وہ فخرِ اقوامِ عرب وہ ناصحِ قرآں بلب وہ رہبرِ اہلِ زمن

وہ مالکِ خلدِ بریں وہ شمعِ بزمِ مرسلیں وہ باغبانِ باغِ دیں وہ مہبطِ روح الامیں

وہ رحمۃ للعالمیں وہ مظہرِ نورِ مبیں وہ حامیٔ دینِ متیں وہ ماحیٔ اہلِ وثن

وہ زینتِ پیغمبری وہ زیبِ شانِ دلبری وہ تاجِ فرقِ سروری ہے گرمِ جلوہ گستری

حیراں ہے مہرِ خاوری یوسف ہوا اسکا مشتری جن و بشر حور و پری ہیں اُسکے در پر نعرہ زن

مفتوں ہے سرگرمِ ثنا ہے اُسکے در کا اک گدا لاتا ہے یہ لب پر دعا ہاں شافعِ روزِ جزا

مطلوبِ محبوبِ خدا دو بخشوا اس کی خطا گو ہے سزاوارِ سزا ہو خوف و شورش نگن

(خزینۂ نعت)

دریا کا آغاز و انجام

اے دلفریب دریا، آتا ہے تُو کہاں سے؟ — اٹھکھیلیاں سی کرتا، جاتا ہے تُو کدھر کو؟
تُھا اک سفید پربت، آتا ہوں میں جہاں سے — ہے اک سیہ سمندر، جاتا ہوں میں جدھر کو
اے نوجوان مسافر! پیدا ہوا جہاں میں — پربت وہ سر سے تا پا، سرسبز و دلکشا تھا
گرمی کے بادلوں کا، بہتا تھا دودھ اس میں — اک چشمہ رواں کی، گودوں میں پل رہا تھا
چوٹی سے برف پگھل کر، اک غار میں تھا آتا — اُس غار سے نکل کر، چشمہ تھا ایک جاری
ہر صبح اُس کا پانی، تارا سا جھلملاتا — پھول اُس کے حاشیہ، کرتے تھے زرنگاری
اک دن، کہ صبح صادق، کافور اُڑا رہی تھی — اور بھیرویں کی دُھن میں، مُرغانِ خوش نوا تھے
شبنم میں سر سے تا پا، ڈوبی ہوئی ہوا تھی — موسم بہار کا تھا، اور دشت پُرفضا تھے
چشمہ کی گود سے میں، نکلا مچل مچل کر — دیکھا کہ سامنے ہے، اک دلفریب میداں
پہنچا وہاں تک آخر، میں نرم نرم چل کر — پھولوں کو چومتا تھا، سبزہ پہ ہو کے غلطاں
پھرتے تھے کچھ پرندے، بن میں کلیل کرتے — دیکھا جو مجھ کو آتا، گانے لگے ترانے
کچھ جانور ہوا سے، پانی پہ تھے اُترتے — چونچیں ڈبو ڈبو کر، گاتے تھے شادیانے

پھولوں کے تھے جو پودے، پانی پہ جھومتے تھے — جھک جھک کے تھوڑا سا، مجھکو سلام کرتے
جنگل کے جانور جو، جنگل میں گھومتے تھے — کرتے تھے وہ اشارے، یا کچھ کلام کرتے
منزل بمنزل آیا، میں دیکھتا نظارے — بھولا نہیں ہوں اب تک، نیچر کی دلربائی
غائب ہوئے نظر سے، منظر وہ آج سارے — اب مجھ سے سبزہ و گل، کرتے ہیں بے وفائی
سنسان وادیوں میں، جاتا ہوں اب پریشاں — موجوں کے اب افق پر، اندھیر چھا رہا ہے
اب بحر شور کا میں، سنتا ہوں شور و افغاں — شاید کہ موت کا یہ پیغام آ رہا ہے
دیکھو! وہ سامنے ہے، کالی بلا سمندر — ہیبت سے جسکی ہر دم، جاتا ہوں کانپتا میں
کیا ہولناک موجیں، اٹھتی ہیں اس کے اندر — گھل مل کے اسکی تہ میں، ہوتا ہوں اب فنا میں"

("معارف" علیگڈھ۔ جلد ۲ نمبر ۱۔ بابت جولائی ۱۹۰۰ء صفحہ

شمع ہستی

(۱)

اے شمع ہستی! اے زندگانی!
بھاتی ہے دل کو تیری کہانی
ہے کوچ تیرا ہر لحہ جاری
جاتی ہے بگٹٹ تیری سواری
بجلی سے بڑھ کر بے تاب ہے تو
یا وہم سے یا خواب ہے تو
کیوں چپ چپاتے ہر دم رواں ہے؟
آئی کہاں سے؟ جاتی کہاں ہے؟
ظاہر ہیں یوں تو سب ترے گن
لیکن نہ پایا تیرا اسرو بن
گذرا نہ کوئی اس ہفت خواں سے
جاہل ہیں تیرے بستر نہاں سے

فی الجملہ ہمت | سب ہار بیٹھے
ہیں سر بزانو | ناچار بیٹھے

(۲)

اے زندگانی | اے شمع ہستی
سونی پڑی تھی | تجھ بن یہ بستی
چاروں طرف تھی | چھائی اندھیری
ناگاہ اُٹھی | اک ڈیک تیری
وہ ڈیک تھی بس | نورِ علیٰ نور
کا ہے کو رہتی | پردہ میں مستور
پھولوں میں جھلکی | تاروں میں چمکی
بخشی جہاں کو | رونق ارم کی
ہوتا نہ یاں جو | تیرا اُبھکانا
چوپٹ ہی رہتا | یہ کارخانہ
کیا پھونک ماری | دُنیا کے تن میں
گویا لگا دی | دَوں خشک بن میں

بزمِ جہاں میں رونق ہے تجھ سے
اس میکدہ میں ہُو حق ہے تجھ سے

(۳)

ہے تیرے دم سے اے عالم آرا
بزمِ عروسی آفاق سارا
سرگرم ہے تُو جادوگری میں
خشکی تری میں
ہیں عشوے تیرے
مٹی کا جوبن تُو نے نکھارا
دے دے کے چھینٹے اُس کو اُبھارا
بے حس کو بخشا احساس تُو نے
دی مُشتِ گل کو بوباس تُو نے
تھی بھولی بھالی بھونڈی بہ ہنگم
تُو نے سکھایا اُس کو جسم و چم
کرتب سے تیرے سانچے میں ڈھلکر
کُندن سے نکلی رنگت بدل کر

ٹھکرا کے تو نے — جب کہدیا "قُم"
اُٹھ بیٹھی فوراً — کر دی تبسّم
بھولی ہے اپنی — اوقات پہلی
پھرتی ہے خوش خوش — کیا اَہلی گہلی

(۴)

پاتی ہے خلقت — جب تیری آہٹ
ہوتی ہے پیدا — اِک گد گداہٹ
مچتا ہے پھر تو — اودھم غضب کا
بجتا ہے ڈنکا — عیش و طرب کا
کہتی ہے دُنیا — تُو ہے تو کیا غم
تُو آئے ننت نت — تو آئے جسم جم
جیتے ہیں جبتک — مرتے ہیں تجھ پر
سب کچھ تصدق — کرتے ہیں تجھ پر
کیا مال ہے جو — تیرے سوا ہے
تو ہی نہ ہو تو — سب پردغا ہے

(۵)

اے سب کی پیاری سب کی چہیتی
کہہ شُستہ زبانی کچھ آپ بیتی
"قدرت کے گھر کی میں لاڈلی ہوں
ناز و نِعَم سے برسوں پلی ہوں
تقویمِ احسن میرا لگن تھا
فردوسِ اعلیٰ میرا وطن تھا
حور و مَلَک کی آبادیاں تھیں
بے فکریاں تھیں آزادیاں تھیں
چلتی تھی ہردم بادِ بہاری
شیر و عَسَل کی نہریں تھیں جاری
میری ادا پر مرتے تھے قدسی
سجدہ پہ سجدہ کرتے تھے قُدسی
تکریم میری ہوتی تھی از حد
ہیں داستانیں جس کی زبان زد

پھر دیس چھوٹا گذری سو جھیلی
پردیسیوں کا اللہ بیلی
پل مارنے کا ہے یاں بسیرا
حبِ وطن ہے ایمان میرا

(۶)

آب و ہوا میں دشت و جبل میں
میری رسائی ہے ہر محل میں
لیکن یہاں میں خلوت نشیں ہوں
ہوں اس طرح پر گویا نہیں ہوں
خوابِ گراں کی حالت ہے طاری
مستی میں گم ہے سب ہوشیاری
جب آتے آتے سبزہ میں آئی
کروٹ بدل کر میں لہلہائی
انگڑائیاں لیں منہ کھول ڈالا
پر آنکھ سے کچھ دیکھا نہ بھالا

داخل ہوئی جب حیواں کے تن میں
اک شور اُٹھا اس انجمن میں
انساں کا جامہ جب میں نے پہنا
اللہ رے میں کیا میرا کہنا
کِس کِس جتن سے میں نے بنایا
رتبہ بہ رتبہ پایہ بپایہ
جامد کو نامی نامی کو حیواں
حیواں کو وحشی وحشی کو انساں
پھیلایا میں نے کیا کیا بکھیڑا
ارگن کو چھیڑا
شادی و غم کے میلے جمائے
نیکی بدی کے جھوٹ اور سچ کے
سکے چلائے
جو ناچ میں نے جس کو نچایا
وہ ناچتے ہی اُس کو بن آیا
القصہ ہوں میں وہ اسم اعظم

ہے بس کے بس میں تسخیرِ عالم
کچھ کچھ سے کھلے ہیں انداز میرے
دیکھے ہیں کس نے اعجاز میرے
مجھکو نہ سمجھو تم آج کل کی
ہوں موجِ مضطر بحرِ ازل کی
رکھوں گی جاری یونہی سفر میں
قعرِ ابد کی لوں گی خبر میں
ہے میری ہستی اک طرفہ مضموں
کچھ بھی نہیں ہوں پر میں ہی میں ہوں
سنتے رہو گے میری کہانی
جب تک ہے باقی دنیائے فانی"

(رسالہ معارف علیگڈھ۔ بابت ستمبر سنہ ۱۹ء۔ جلد ۳۔ نمبر ۳ صفحہ ۸۵، ۸۶)

نغمۂ زندگی

(۱)

غمزدہ ہو کر نہ یہ کہنا کبھی — خواب سے بڑھکر نہیں کچھ زندگی
خواب میں ہر شے کا ہو فرضی وجود — حاشا! ایسی نہیں یہ ہست و بود
ہاں، نہ سمجھنا اسے وہم و خیال — وہم بھی ہوتا ہے کہیں لازوال!
اگلی دُنیا میں یہی ہے جھلک — اور نہیں اس کی لبِ گور تک
خاک میں ہوتا ہے بدن پائمال — روح فنا ہو، یہ نہیں ہے مجال

(۲)

رنج سے مطلب، نہ خوشی ہی سے کام — کام سے ہی کام، یہاں پر مدام
کام میں مشغول ہیں جو ہر گھڑی — روز وہ طے کرتے ہیں منزل نئی
آج کا کل پر نہیں رکھتے جو کام — اُن کا یاں ہے آج، تو کل واں مقام

(۳)

علم کی منزل ہے بڑی اور کڑی — وقت رواں اور رواں ہر گھڑی

دل ہیں توانا و دلیر و جواں | خوف سے لرزاں ہیں مگر ہر زماں
دیکھئے کس طرح یہ منزل ہو طے | بس یہی ڈر ہے، یہی خوف ہے

(۴)

دنیا، دیکھو، تو ہے میدانِ جنگ | دوڑیے آئیں، تو نہیں ہے یہ تنگ
فوج پہ فوج آتی ہے اس میں چلی | زندگی اب ڈالتی ہے کھلبلی
برف کے تودے ہیں مگر جا بجا | سن، سن، اچلتی ہے برابر ہوا
ابر سے مطلع پہ ہے کچھ تیرگی | آگ ہے ہر خیمہ کے اندر بجھی
فوج جو غافل سے ہے پڑی سو رہی | سر پہ اس کے ہے قضا کھیلتی
جس کی تلوار نے چھوڑا نیام | اس کا، میداں سے ہے آگے مقام
گھوڑا جس کا ہے ذرا سست پے | اس کے پس جانے میں کیا دیر ہے

(۵)

مرد بنو مرد کہ بن جائے کام | کام کرو کام، کہ رہ جائے نام
محنت کا جھیلنا شیوہ کرو | میوا، کھانا ہے، تو سیوا کرو
رکھو نہ آئندہ زمانے سے کام | گرچہ امیدوں سے بھرا ہو تمام
اگلے زمانے کو بھی تم جاؤ بھول | مردہ لاشوں کا جگانا فضول
زندہ اگر ہے، تو یہی حال ہو | پنہاں اسی حال میں اقبال ہو

محنت پر جس کی بندھی ہے کمر — ہر دم جس کی ہے خدا پر نظر

کام میں رہتا نہیں ناکام وہ — رکھتا، تقدیر کو ہے رام وہ

کام میں رہتے تھے جو ہر وقت چور — جن کے دم سے ہے یہ سارا ظہور

زندگی اُن کی یہ بتاتی ہے راز — غفلت و آرام سے باز آؤ! باز!

کام میں گھُل جاؤ، گھبراؤ تم — زندہ جو رہنا ہے، تو مر جاؤ تم

نام انھیں کا ہے جہاں میں بلند — آگ پہ جلتے تھے جو ہو کر سپند

دل پہ اُٹھاتے تھے جو محنت کے داغ — رکھ گئے اِک ایک قدم پر چراغ

(٦)

اُٹھو! اُٹھو! قدم آگے بڑھاؤ — منزل، کھوٹی نہ ہو، اب جیت جاؤ

وقت کے میداں میں کرو آؤ جاؤ — ریت پہ کچھ نقشِ قدم چھوڑ جاؤ

سامنے دیکھو! ہے سمندر پُرجوش — ہر دم طوفاں سے ہے اُٹھتا خروش

اک جہاز آ کے بھنور میں گرا — تند ہوا لے گئی تختے بہا

آتے ہیں بہتے ہوئے تختے اِدھر — اُترے ہیں ساحل پہ کچھ انساں مگر

ہوش میں آکر جو یہ ڈھونڈیں گے راہ — نقشِ قدم ہوں گے تمہارے گواہ

دیکھ کے اس ریت پہ نقشِ قدم — ہوں گے یہ طوفاں زدہ اب تازہ دم

(۷)

کام سے جن کے ہے یہ سب تگ و پو — کرتے ہی رہتے ہیں سدا دوڑ دھوپ
ایک منٹ کے لئے تھم جائیں گر — قافلۂ دنیا کا ہو زیر و زبر
غول کے مانند ہیں وہ تیز گام — خضر کا پرواز ندہ انہیں سے ہے نام
جھیلتے دنیا میں کڑی ہیں یہی — کوسکتے دنیا کی گھڑی ہیں یہی
وہ جو کریں کام، تو پھر کیا نہ ہو — وہ نہ ہوں دنیا میں تو دنیا نہ ہو
ان کے ہی دم سے ہے یہ چل چل پھی — ان کے ہی سایہ سے ہے یہ روشنی
ان کی بدولت ہے یہ نقش و نگار — ان کے قدم سے ہے یہ ساری بہار

(۸)

باندھو ہمت کی کمر تم بھی چست — عزم ہو بالجزم، تو نیت درست
دل کی امنگوں کو نہ ہرگز دباؤ — چاہو، میداں میں جدھر، دوڑ جاؤ
کام کرو، نام خدا ہو جواں — کام سے رہتا ہے سدا نام یاں
وقت پہ ہر کام کو کرتے رہو — کام پہ اور نام پہ مرتے رہو
شکووں کی حد سے، بڑھا دو قدم — قسمت ہمہ دیکھتی رہ جائے بس
رنج و مصیبت سے رہو کھیلتے — کڑیاں قسمت کی رہو جھیلتے
وقت کا، اور فرض کا رکھو خیال — کام میں ناکام ہو تم، کیا مجال؟

آخری بندو کی یہی عرض ہے
(فرض کو پورا کرو) یہ فرض ہے

دولتِ دُنیا ہے اسی سے عیاں
راحتِ عُقبیٰ ہے اسی میں نہاں

(۹)

جب نہ رہا قوم میں باقی یہ جوش
ہوگئیں سب قوتیں اُس کی خموش

دین کی گرمی ہے، نہ دُنیا کا اوج
پھر گئی یاروں پہ تباہی کی موج

کاش ہو وہ ولولہ پھر موجزن
جس نے قبائل کو کیا انجمن

جس نے ہراک فرد کو گرما دیا
ذرّہ و خورشید کو لڑوا دیا

جس نے کیا علم کا پرچم بلند
جس نے کیا چشمہ تعصب کا بند

جس نے کیا فتح کا دریا رواں
جس نے کہ تہذیب کا باندھا سماں

جس نے کہ رگ رگ میں وہ جادو بھرا
جس سے کہ چونچال تھا چھوٹا بڑا

کام میں مشغول تھے سب صبح و شام
فرض پہ مرتا تھا ہر اک خاص و عام

کام میں رہتی تھی سدا بیکلی!
پیرو جواں کی تھی یہی زندگی،

علم و عمل کا تھا ہر اک جا ظہور
پھیل گیا صبح تمدن کا تھا نور

کاش وہی صبح ہو پھر جلوہ گر
قوم میں جنبش ہو وہی سر بسر

زندہ دلی کا وہی پیدا ہو جوش
بزم میں برپا ہو وہی ناؤ نوش

پھر وہی آ جائے مرقعِ نظر　　جس میں ہر اک صورت تھی پُر اثر
پھر اسی اُمت کا ہو مجمع بہم　　جس کا لقب تھا کبھی خیر الامم

چُپ ہو، اے دل کہ تیری آرزو
سُننے نہ پائے، فلکِ کینہ جو

(رسالہ "معارف" علیگڈھ۔ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۱۸ء۔ جلد۔ ۲۔ نمبر۔ ۴۔ صفحہ۔ ۹۷۔ ۱۰۰)

تلوار کی آنچ

(۱)

اے ہمہ جور و ستم اے تیغ تیز! — تجھ سے بھلا کس کو مجالِ ستیز؟
آب وہ تیری، کہ نہ ٹھہرے نگاہ — آنچ وہ تیری، کہ نہ دا کی پناہ
رہزنِ سفاک کی یاور ہے تو — خون کے دریا کی شناور ہے تو
سیکھے ستم کس ستم ایجاد سے؟ — شور ہے برپا، تری بیداد سے
شوخی و بیباکی و تیزی میں برق — آگ ہے اور آگ میں ہستی ہے غرق
تند مزاجی میں تو شداد ہے — بیضۂ فولاد کی اولاد ہے
آتشِ سوزاں کا پیا تو نے دودھ — اس لئے جاں سوز ہے تیرا وجود
حیف تیری سختی و آہن دلی — نوعِ بشر کی ہے تو دشمن دلی
خرمنِ ہستی میں لگاتی ہے آگ — عافیت و امن سے رکھتی ہے لاگ
گو کہ مجلا ہے تو آئینہ وار — تیرہ درونی ہے تیری آشکار

تیری گھٹی میں پڑا زہر ہے — چال قیامت، تو ادا قہر ہے
فتنۂ عالم ہے تیرا بانکپن — شوخی و شنگی ہے تیرا خاص فن
شکل انوکھی، تو نرالی ہے دھج — جسم بھی خمدار، طبیعت بھی کج
قحط زدوں کا سا تن و توش ہے — کھانے پہ ڈھوکے، تو بلا نوش ہے
تیری جبلت ہے فسوق و جدال — ناحق و حق کا نہیں تجھ کو خیال
قتل کا رکھتی ہے بہت چاؤ تُو — رن میں کیا کرتی ہے تتھراؤ تُو
اُف نہ کرے۔ لاکھ گلے کاٹ کر — جی نہ بھرے تیرا لہو چاٹ کر
بحرِ فنا کہئے ترے گھاٹ کو — جس نے ڈبوئے سینکڑوں بیڑے ڈبو
گرچہ سراپا ہے ترا، آب گوں — پر تری چتون سے ٹپکتا ہے خوں
تُو نے اُجاڑیں بہت آبادیاں — چھین لیں اقوام کی آزادیاں
تُو نے کروڑوں کئے بچے یتیم — لاکھوں ہی باپوں کے کئے دل دونیم
لے گئی ماؤں کی کمائی کو لوٹ — رہ گئیں بیچاریاں چھاتی کو کوٹ
دلہنیں روتی ہیں تیری جان کو — ساتھ ہی لیجائیں گی ارمان کو
موتیوں سے مانگ تھی جنکی بھری — اُن سے کراتی ہے تو گریہ گری
تُو نے رفیقوں کو رُلایا ہے خوں — غم سے عزیزوں کو ہوا ہے جنوں

تفرقہ پرداز ! یہ کیا کر دیا
گوشت کو ناخن سے جُدا کر دیا

چاہتی ہے بغض و عداوت کو تُو
انس و محبت کی نہیں تجھ میں بُو

تیری دغا بازی ہے ضرب المثل
غیر ہے، قبضہ سے گئی جب نکل

تُو نے وفا کی نہیں پٹّی پڑھی
اُس کی ہوئی، جس کے تُو ہتّے چڑھی

کون کرے تجھ سے رفاقت کی آس
کچھ نہیں تجھ کو حقِ صحبت کا پاس

رکھتی نہیں سابقہ لُطف یاد
کور نمک ہے، ترا کیا اِعتماد

میل حریفوں سے، یگانوں سے چھوٹ
نکلے گا مالک کا نمک پھوٹ پھوٹ

(۲)

مملکتیں خاک سیہ تو نے کیں
تیری قساوت نے اُجاڑی ہیں

بستیاں کرتی ہیں پڑی بھائیں بھائیں
مقبرے آباد ہیں کچھ دائیں بائیں

اُٹھے تیری ذات سے جو جو فساد
اہلِ تواریخ کو کچھ کچھ ہیں یاد

ثبت جریدہ اُنھیں میں نے کیا
ہے وہ خلاصہ تری روداد کا

تو ہی بھرت کھنڈ کے بھارت میں تھی
تیری خوشی جانوں کی غارت میں تھی

ہند کے جو دھا تھے بڑے شور بیر
کھا گئی تو سب کو دم دار و گیر

تو نے نصیحت نہ کسی کی سُنی
چٹ کئے اُس عہد کے گیانی گُنی

وادیٔ توران میں چمکی کبھی، دیتی تھی ایران کو دھمکی کبھی
باڑھ پہ تیری جو چڑھا پہلواں، نام کو بھی اُس کا نہ چھوڑا نشاں
تیری جو ضحاک سے گہری چھنی قوم کا ہر فرد بنا گشتنی
معرکۂ رستم و افراسیاب تیری بدولت ہوا زیبِ کتاب
قتل کا دھبا ترے دامن پہ ہے خونِ سیاوش تیری گردن پہ ہے
خاک اُڑائی یہ تیری آب نے جان دی ناشاد ہی سہراب نے
تو جو طرفدار سکندر ہوئی خاک میں دارا کو ملا کر رہی
تختِ کیاں کا دیا تختہ اُلٹ کردی یونان کی کایا پلٹ
لشکرِ یوناں کی جلو جب پھری باختر و بلخ پہ بجلی گری
تو نے عرب سے جو کیا اتفاق فارس و روما کی مٹی طمطراق
جب ہوئی فارس پہ تیری دستبرد دخمہ بنی بارگاہِ یزدجرد
شوکتِ ساسان کے ڈیرے لدے بجھ گئے زردشت کے آتشکدے
غرب کی جانب کو جو تو جھک پڑی شام پہ اک ضرب لگائی کڑی
روم میں برپا کیا شورِ نشور دولتِ ہرقل کا ہوا شیشہ چور
توڑ دیا روم کا سارا طلسم رہ گیا بے جان سا مُردا جسم

ہاشمیوں کا نہ دیا تُو نے ساتھ — آلِ اُمیہ کا پڑا تجھ پہ ہاتھ
ڈھایا ہے کیا تُو نے غضب برملا — گرم کیا معرکۂ کربلا
طرفہ ستمگار ہے عالم میں تُو — عید مناتی ہے محرم میں تُو
پھٹ نہ گیا کیوں ترا ظالم جگر — ڈوب مری کیوں نہ تُو، اے خیرہ سر
قہرِ الٰہی سے جو ڈرتی کبھی — مرتی پہ یہ کام نہ کرتی کبھی
ہند پہ محمود کی لشکرکشی — یاد دلاتی ہے تیری سرکشی
بدلی ہوا، ایک تری چال میں — ٹوٹ پڑی دولت جے پال میں
کیا ہی نظر سوز تھی تیری چمک — دھاک تھی کالنجر و قنوج تک
یاد ہیں کچھ تجھ کو عجب داؤ گھات — توڑ دیا بتکدۂ سومنات
تو نے ہڑپ کر لئے لاکھوں گہر — کم نہ ہوئی پر تری جوع البقر
غور سے جس دم تری آندھی چلی — ہند کی سینا میں مچی کھلبلی
رائے پتھورا کا وہ جاہ و جلال — ہو گیا پل مارتے خواب و خیال
بن گئی ہر بزم طرب غمکدہ — دہلی و اجمیر تھے ماتمکدہ
سوگ میں رانی نے کیا سینہ چاک — آتشِ سوزاں میں ہوئی جل کے خاک
رائے رہا، اور نہ رانی رہی — زیبِ سخن تیری کہانی رہی

چونک پڑا فتنۂ جنگِ تتار — لشکرِ چنگیز کا اُٹھا غبار
چھا گیا اک ابرِ ستم چار سُو — خون کے سیلاب بہے کُو بکُو
کٹ گئے خوارزم و خراساں کے باغ — زمزمۂ بلبل کا بنا شورِ زاغ
دیلم و بغداد پہ ٹوٹا غضب — درہم و برہم ہوئی بزمِ عرب
مصر پہ تاراج چلی سربسر — آگ وہ بھڑکی کہ جلے خشک و تر
کشورِ یورپ سے اُٹھا غلغلہ — وادیٔ یردن میں پڑا زلزلہ
جنگِ صلیبی تھی وہ خونخوار جنگ — ٹوٹ پڑا جس کے لئے کُل فرنگ
تو جو برہنہ ہوئی، او فتنہ گر! — تن سے جُدا ہو گئے نو لاکھ سر
نکلا تجھے لے کے جو تیمور لنگ — پھونک دیا چار طرف صورِ جنگ
ناک چنے روس کو چبوا دیئے — قاف میں سر دیووں کے دبوا دیئے
خون سے گُل خاکِ صفاہاں ہوئی — کانپ اُٹھی تختگہِ ہند بھی
ناحیۂ شام سے تا حدِ چیں — مقتلِ اقوام بنا دی زمیں
تاجورِ اطراف کے تھرا گئے — ناک میں ہمسایوں کے دم آگئے
جب ہوئی نادر کی تو زیبِ کمر — خلقِ خدا بول اُٹھی "الحذر"
حضرتِ دہلی کنفِ امن و داد" — جسکو کیا تھا کبھی خسرو نے یاد

اس کی یہ حالت ہوئی زار و زبوں　　کوچہ و برزن میں بہی جو شے جنوں

دینے لگے اس میں صدا خوف و بیم　　زلزلۃ الساعۃ شیء عظیم

کیجئے القصہ کہاں تک بیاں

فرد مظالم سے ہے تیری داستاں

(رسالہ معارف علی گڈھ۔ بابت نومبر سنہ ۱۹ء۔ جلد ۳۔ نمبر ۵۔ صفحہ ۱۲۵-۱۲۸)

دعوتِ عمل

سے ہے چاند پہلی رات کا بالائے بام تو
چمکے دنوں میں گر، تو ہے ماہِ تمام تو

فرصت ہو عیش کی تو غنیمت سمجھ اُسے
جم اپنے وقت کا ہے جو رکھتا ہے جام تو

گر تیرے دل میں قوتِ ایماں ہو جلوہ گر
شاہوں کو اپنا کر کے رہے گا غلام تو

ساقی! کر آج محفلِ رنداں کو جلوہ خیز
ساغر کا لے کے ہاتھ میں ماہِ تمام تو

پیرِ مُغاں کے فتوے پہ کر بے خطر عمل
گر جانتا نہیں ہے حلال و حرام تو

شاہوں کے قصر میں نہیں ملتا ترا پتہ
کرتا ہے بیکسوں کے دلوں میں مقام تو

دل میں ترے نہیں ہے اگر اُلفتِ وطن
کرتا ہے پھر عبث طلبِ ننگ و نام تو

ہر روز لطف اُٹھائے گا عیدِ صیام کا
میخانے میں گذار دے ماہِ صیام تو

زاہد کی پیروی سے ملیگی شرابِ خلد
کر اپنے دل سے دور یہ سودائے خام تو

اک جام صبح کو ملے، اک شام کو ملے
کر آرزو خدا سے یہی صبح و شام تو

گر چاہتا ہے، داخلِ دار السلام ہو
پیرِ مغاں کو روز کیا کر سلام تو

آبِ حیات خضر سے کرتا ہے کیوں طلب
رکھتا ہے ہاتھ میں اگر اک مے کا جام تو

ہشیار ہو چکے ہیں پرندے یہاں تمام
زاہد کی طرح مکر کا پھیلا نہ دام تو

اے آفتاب! کس کو ہی کرنا تجھے شکار
کرنوں کا ہر طرف جو بچھاتا ہے دام تو

واعظ تجھے بتا نہیں سکتا وہ اپنا راز
دیتا نہیں ہے اپنی زباں کو لگام تو

ہاں کر بلند نعرۂ حق بے خطر سلیم
باطل کے اس فسانہ کو کر دے تمام تو

(رسالہ ہمایوں بابت جولائی ۱۹۲۳ء۔ جلد ۴۔ نمبر ۱۔ صفحہ ۶۱)

گھمنڈ

تیغِ قاتل کو ہے اپنی آبداری پر گھمنڈ
جاں نثاروں کو ہے اپنی خاکساری پر گھمنڈ

آئیں، اور تصویر کھینچیں تیری اے جادو نظر!
جن سخن دانوں کو ہو، جادو نگاری پر گھمنڈ

کر قلم خنجر ذرا، اے جذبۂ حُبِّ وطن!
ہیں کھڑے، جن کو ہو اپنی جاں نثاری پر گھمنڈ

کس نے دیکھی ہیں تری برقِ نظر کی شوخیاں
بجلیوں کو ہے گر اپنی بے قراری پر گھمنڈ

دے گا ساقی بھی شرابِ تند کے دریا بہا
شوق سے آئیں، جنھیں ہو بادہ خواری پر گھمنڈ

ٹیڑھ کی لے اہلِ ہمت سے تو قائل ہم بھی ہیں
چرخ کو کیا کیا ہے، اپنی کج مداری پر گھمنڈ

حیف وہ اب اہلِ دُنیا کے قدم کی خاک ہیں
تھا جنھیں میدانِ دیں میں شہسواری پر گھمنڈ

ایک ہی چتون میں ساقی کی وہ غافل ہو گئے
کرتے تھے اکثر جو اپنی ہوشیاری پر گھمنڈ

چار تنکے بھی نہ پھونکے آشیانہ کے مرے
تھا بہت برقِ تپاں کو شعلہ باری پر گھمنڈ

کاسۂ سر اُن کے ہیں پامالِ راہِ بے کساں
جن شہنشاہوں کو تھا کچھ تاجداری پر گھمنڈ

سرکشوں کی سرکشی کی خاک اُڑا دیتی ہے یہ
کیوں نہ ہو ہم بے کسوں کو خاکساری پر گھمنڈ

کر دیا چاک اسکو تیرے حُسنِ عالم سوز نے
تھا حجابِ قدس کو جس پردہ داری پر گھمنڈ

ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے یہ نوجوانی کی بہار　　　کرتے ہو تم پھر بھی اِس ناپائیداری پر گھمنڈ

آج کھولی ہے انھوں نے مے فروشی کی دکان
تھا جنھیں کل تک بہت پرہیزگاری پر گھمنڈ

("الہلال" دہلی - جنوری ۱۹۲۶ء صفحہ نمبر - ۳۷)

عرارِ نجد

قافلے پھرتے ہیں مجنوں سے بیابانوں میں
تیرے محمل کا نشاں گم ہے شتربانوں میں

چشمۂ حسن ترا جب سے اُبلتا دیکھا
ایک طوفان ہے برپا مرے ارمانوں میں

پیرہن کس کا بسائے گی تو اے بادِ صبا
نکہتیں دوڑتی پھرتی ہیں گلستانوں میں

کس کی قسمت ہے کہ اُس صبح کا جلوہ دیکھے
چھُپ رہی ہے جو حسینوں کے گریبانوں میں

بارشوں کا مجھے ڈر ہے نہ سمندر کا خطر
کھیلتی پھرتی ہے کشتی مری طوفانوں میں

اس طرح چلتی ہے قوموں میں تعصب کی ہوا
دوڑتی آگ ہے جس طرح نیستانوں میں

کاوشیں دردِ محبت کی نہ مجھ سے پوچھو
گم ہوئے ڈوب کے نشتر مری شریانوں میں

چپّے چپّے پہ یہاں دفن ہے گنجینۂ عشق
یہ صدا گونجتی ہے نجد کے ویرانوں میں

ہم مسلمانوں کے ایماں پہ ہے قبضہ جس کا
اُس خدائی کا پتہ ملتا ہے بتخانوں میں

چشمِ میگوں سے تری آنکھ بھلا کیا نسبت
یہ چھلکتے ہوئے ساغر جو ہیں میخانوں میں

داستاں جورِ فلک کی نہ ہوئی ختم نہ ہو
محفلیں مٹ گئیں جم جم کے شبستانوں میں

روح بالیدہ ہو جس سے وہ طرب کا ساماں
گم ہے اے دولتِ دنیا ترے کاشانوں میں

دیں گے اے زہد، یہ تیرے خس و خاشاک کو پھونک جو شرر ہیں مئے گلرنگ کے پیمانوں میں

ایک ہی دین کے پابند ہیں سب اہلِ وفا ایک زنجیر کی جھنکار ہے دیوانوں میں

(ق)

زندہ رہنے کا انھیں حق نہیں دُنیا میں سلیم جب ترقی کی اُمنگیں نہ ہوں انسانوں میں

خاک میں اُن کو ملا دیتی ہے خود بادِ صبا

قوتیں نشو و نما کی نہ ہوں جن دانوں میں،

رسالہ "معارف" علی گڈھ۔ فروری ۱۹۲۵ء

جلد۔ ۱۶۔ نمبر۔ ۲۔

وطن سے خطاب

مجھے اے وطن! تو ذرا بتا، کدھر اب ہیں وہ تری صنعتیں
جو ہر ایک ملک سے لائی تھیں، ترے پاس کھینچ کے دولتیں
تجھے مفلسی نہ پسند تھی، تری راہِ سعی نہ بند تھی
تری ہمت ایسی بلند تھی، کہ نثار اس پہ تھیں ہمتیں
تری کوششوں سے لگی تھی لَو، اسی لَو سے پھیل رہی تھی ضَو
ہوئے سست ملک بھی گرم رَو، تری دیکھ دیکھ کے محنتیں
تری صنعتوں میں وہ رنگ تھا، کہ فدا ہر اہلِ فرنگ تھا
جنھیں دیکھ باغ بھی دنگ تھا، وہ ہوئی تھیں اُن پہ فریفتیں
گیا جب بدل وہ ترا چلن، نہ رہا وہ علم ترا نہ فن،
گئیں تجھ سے چھن وہ اب اے وطن! جو خدا نے دی تھیں لیاقتیں
ہوئی منتشر وہ تری سبھا، جو ہر اک ہنر سے تھی آشنا
جو ہر ایک علم پہ تھی فدا، ہوئیں ختم جس پہ فضیلتیں

نہ رہا وہ علم کا اب سماں، نہ وہ صنعتوں کا رہا نشاں

نہ رہی وہ دولت شائگاں، ہوئیں دور اب وہ سعادتیں

اگر اب بھی گرم عناں ہو تو، رہ سروری پہ رواں ہو تو

تو پھر افتخارِ جہاں ہو تو، تجھے پھر ملیں وہی عزتیں

اگر اب بھی تیرا بڑھے قدم، ترے سر پہ علم کا ہو علم

وُہی جاہ پھر ہو، وُہی حشم، وُہی دولتیں وُہی ثروتیں

اگر اب بھی دوڑ کے چارسُو، کرے تازہ صنعتیں اپنی تو

تو بڑھے وہ پھر تری آبرو، کہ ہوں محو ساری یہ ذلتیں

نئی صنعتوں کی بھی لے خبر، کہ ترے چمن میں ہوں سب شجر

تری انگلیوں میں ہوں سب ہنر، تری ارغنوں میں ہوں سب گتیں

یہی آرزو ہے اب اے وطن، کہ شگفتہ پھر ہو ترا چمن

ترا بخت پھر ہو ضیا فگن، تری دُور سب ہوں یہ کلفتیں

(رسالہ "صنعت وتجارت" جنوری ۱۹۲۵ء - جلد ۱ - نمبر ۱ - صفحہ ۲۵)

گوشۂ قناعت

(انگریزی زبان کے شاعر ڈائر کے خیالات کی ترجمانی)

دل مرا اک سلطنت ہے جسمیں ہوں میں حکمراں — روز و شب رہتا ہوں میں اس سلطنت میں شادماں
جو مسرت دی ہے مجھکو میری صُبح و شام نے — ہیچ ہیں دُنیا کے سارے لُطف اُسکے سامنے
پاس لوگوں کے بہت سی ایسی چیزیں ہیں ضرور — جو مجھے حاصل نہیں، لیکن مرا دل ہے غیور
بے ضرورت آرزوئیں اُن کی کر سکتا نہیں — میں شکنجے میں طمع کے آکے مر سکتا نہیں
میں ضرورت سے زیادہ کی طلب کرتا نہیں — جام کیوں چھلکے مرا میں اس قدر بھرتا نہیں
دوسروں پر حکمرانی کی نہیں خواہش مجھے — گِلہ کیوں ہو۔ گلہ بانی کی نہیں خواہش مجھے
آج جو عشرت میں ہیں۔ کل ہے انھیں عُسرت کا ڈر — آج عزت جنکی ہے۔ کل ہے انھیں ذلت کا ڈر
رہتے ہیں چوروں سے لرزاں، مال و زر ہے جنکے پاس — خونِ دل پیتے ہیں وہ لعل و گہر ہیں جنکے پاس
ہے اِن اندیشوں سے اور فکروں سے آزادی مجھے — ہے قناعت نے دیا سرمایۂ شادی مجھے
ہو کوئی عُسرت میں، تو میں طعن سے ہنستا نہیں — ہو کوئی عشرت میں، تو میں رشک میں پھنستا نہیں
کوئی غم ہو، دل مگر میرا ہے اطمینان میں — تیرتی ہے میری کشتی بے خطر طوفان میں

ہے ضرورت سے زیادہ پاس جن کے مال و زر
رکھتے ہیں اس سے زیادہ کی ہوس شام و سحر

پاس میرے کچھ نہیں اور چاہتا بھی کچھ نہیں
اس ہوس میں دل مرا رہتا نہیں اندوہگیں

ہے بہت کچھ پاس انکے، پھر بھی رہتے ہیں فقیر
پاس میرے کچھ نہیں پر ہوں حقیقت میں امیر

وہ ہوس سے مرتے ہیں، جیتا ہوں استغنا سے میں
دین سے بیزار ہیں وہ، ہوں بری دنیا سے میں

وہ پہاڑی پر چڑھیں، رہتا ہوں میں میدان میں
ان کو ہے گرنے کا خطرہ میں ہوں اطمینان میں

حرص کی جو آفتیں ہیں، وہ کہاں سہتا ہوں میں
پس قناعت ہی کے گوشہ میں مگن رہتا ہوں میں

(رسالہ "معارف" اعظم گڑھ۔ اگست ۱۹۲۶ء
جلد۔ ۱۸۔ نمبر۔ ۲۔ صفحہ۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲)

جذباتِ داس مرحوم

آہ اے کہ تری ہر لہر سدا
مشغول ہے قطرہ نوازی میں

تو مست ہے عشوہ طرازی میں
میں گم تری شعبدہ بازی میں

تو نور و ضیا کا سمندر ہے
ظلمت سے بھری ہستی ہے مری

تو موج پہ ہے، تو اوج پہ ہے
مشتاق تری پستی ہے مری

اس وقت کہ دُنیا نیند میں ہے
شناساں ہے سطح سمندر کی

ہے چاندنی پھیلی چار طرف
دلچسپ فضا ہے منظر کی

کیا سچ ہے کہ تو بھی جلوہ نما
ہے جلووں کے اس منظر میں

کیا تیری نشیلی آنکھوں نے
مستی یہ بھری ہے سمندر میں

یہ سچ ہے، تو ڈال اے حسنِ ازل
پرتو مرے اس غمخانے پر

مشتاق ہوں تیرے کرشمے کا
ہوں شیفتہ تیرے ترانے پر

پہناؤں گا جامہ نظم کا میں
جب اپنے دل کی صداؤں کو

رگ رگ میں برنگِ برقِ تپاں
دوڑاؤں گا تیری اداؤں کو

اے مطربِ روح ہو جلوہ فگن ۔۔۔ پھر آج شبِ تنہائی میں
ہے چھیڑتا اپنے ترنّم کو ۔۔۔ تو روحوں کی گہرائی میں

(۲)

اس وقت سے ہے نورِ سحر کی کرن ۔۔۔ ہے بحرِ تلاطم خیز عیاں
پھیلی ہیں فضا میں روشنیاں ۔۔۔ دوڑی ہیں ہوا میں روشنیاں
سن سن کے صدائیں مست تری ۔۔۔ موجوں پہ سماں ہے عجب طاری
اُٹھتی ہیں کبھی سب جوش میں آ ۔۔۔ گرتی ہیں کبھی بے خودساری
یہ سچ ہے کہ تیرے ساز میں ہے ۔۔۔ موسیقی کی اک شان نئی
پر ہے یہ کسی کے اشارے سے ۔۔۔ ہر تان نئی ہر آن نئی
پھر بھی مری فکرِ بلند ورسا ۔۔۔ کر سکتی نہیں اس راز کو حل
ہے کس کا اشارۂ مخفی یہ ۔۔۔ ہے کس کا پسِ پردہ یہ عمل
جو تیرے ساز کی تانوں میں ۔۔۔ بھرتا ہے عجب مستانہ دھنیں
دلچسپ دھنیں، پُرجوش دھنیں ۔۔۔ سراپا دھنیں جو اُن کو سُنیں

(۳)

آنکھوں سے زمین وزماں کی سُنی ۔۔۔ ہے ہستی پُراسرار تری

ہر صبح کے نور میں جلوہ نما — ہے روشنی رخسار تری
جب انگلیاں تیری چھیڑتی ہیں — بادِ سحری کے ارگن کو
ہیں کرتی مست سمندر کو — ہیں لاتی رقص میں گلشن کو
کرتا ہے سروں کو بلند اگر — تو اپنی مچلتی تانوں سے
ہلچل سی ہے پڑتی آندھیوں میں — جوش اٹھتا ہے طوفانوں میں
کیا چیز ہے یہ پوشیدہ بتا — نغموں میں ترے اے مست ادا
ہوتی ہے کبھی جو آہ و فغاں — بنتی ہے کبھی ہنسنے کی صدا
لرزہ میں ہے دنیا کی رگِ جاں — سن سن کے تری آہنگوں کو
رعشہ ہے امنگوں پر طاری — ہے جوش دلوں کی ترنگوں کو

(۴)

دی صبح نے بانسری چھیڑ اپنی — ہے گونج رہی آواز اس کی
آواز ہے دلکش اور دھیمی — کم کم ہے ابھی پرواز اس کی
چھوٹی ہے ابھی سورج کی کرن — ہے جھلمل جھلمل پانی میں
منہ بند کنول جو تیرے ہیں — کھلنے پہ ہیں مائل پانی میں
جب کرنیں جھیل کے پانی کو — چمکا کے سنہری کر دیں گی

پھولوں کو ہنسا کے تجلّی سی ۔۔۔ پانی کی فضا میں بھر دیں گی
پھر مست ترنّم ہو کے کنول ۔۔۔ قدموں پہ ترے جھک جائیں گے
پنکھ اپنے وجد میں ٹوٹ کر ۔۔۔ گگلوں کی طرح پھیلائیں گے
ہے صبح کی لے میں تیری صدا ۔۔۔ کرتی ہے جو یوں مدہوش مجھے

یہ وجد میں لانے والی ہوا
رکھ سکتی نہیں خاموش مجھے

("ادبی دنیا"۔ جولائی ۱۹۲۹ء۔)

آریوں کی پہلی آمد ہندوستان میں

(۱)

وہ دیکھ، کہ موجیں رقص کناں ہیں سطحِ زمیں پر گنگا کی
نوواردِ آریہ حیرت میں ہیں دیکھ کے شان امڈ دریا کی
گنگوتری سے آتی ہے چلی، اٹکھیلیاں کرتی دھار اسکی
آزادی ہے تیور سے عیاں، متوالی ہے رفتار اسکی

(۲)

اُتّر کی طرف جب اُٹھتی ہے، اِس قافلۂ مغرب کی نظر
پڑتی ہوئی کرنیں سورج کی، ہیں دیکھتے برف کے تودوں پر
پر قلۂ کوہِ ہمالہ پر، عظمت کے ہیں بادل چھائے ہوئے
سینوں کو ہیں تانے دیو کھڑے، امبر سے سروں کو ملائے ہوئے

(۳)

برگد کے درختوں کے جنگل، پھیلے ہیں پہاڑ کے دامن میں
شاخیں ہیں جو اُن کی سایہ فگن، ظلمت کا سماں ہے ہر بَن میں

پھرتے ہیں وہ فیلِ مست یہاں، ہے دیو کا جن کے قد پہ گماں،
یہ کالی گھٹا جب دوڑتی ہے، آتا ہے نظر ہیبت کا سماں

(۴)

ہیں رنگ برنگ کے پھول کھلے، زینت ہے چمن کی شباب اُنکا
کھولا ہے نسیمِ سحر نے ابھی، کس شان سے بندِ نقاب اُنکا
آئے ہیں مسافر ہند میں جو، خیبر کے دروں سے اُتر کے ابھی
دیکھے تھے انھوں نے لالہ و گُل، پامیر کی وادی میں نہ کبھی

(۵)

طائر بھی یہاں پیدا ہیں کئے، قدرت نے عجب گلرنگ حسیں
گر زمزمے اُن کے رشی سُن لیں، یاد آئے انھیں فردوس بریں
اِندر کے اکھاڑے کی پریاں، گاتی ہیں جو دِل کش راگنیاں
یہ لوچ سُروں میں اُن کے نہیں، یہ سوز گلوں میں اُن کے کہاں!

(۶)

سورج کی چمکتی ہوئی کرنیں، ہیں چھیڑتی ٹھنڈی ہواؤں کو
بھر دیتی ہیں نور و حرارت سے، باغوں کو اور اُن کی فضاؤں کو

سوتی ہوئی سوتیں چشموں کی، اُٹھتی ہیں سب آنکھیں مَل مَل کر
دھاریں ہیں جو برف کے پانی کی، آتی ہیں پہاڑوں سے چل کر

(۷)

اے آریو! آؤ قدم رکھو، ان حُسن بھرے گلزاروں میں،
جنت کے مزے لوٹو گے سدا، اس پاک زمیں کی بہاروں میں
تم گنگ وجمن کے کناروں پر، شہر اپنے نئے آباد کرو
گا گا کے بھجن، کر کر کے ہَوَن، ہو جاؤ مگن، دل شاد کرو

("زمانہ" کانپور۔ جون ۱۹۲۴ء۔ صفحہ ۳۶۶-۳۶۷)

دُعا

ڈال دے میری صدا سے کھلبلی احباب میں
بھر دے برقِ زندگی اُن کے دلِ بیتاب میں

یارب! اُنکی چشم و دل کو بھی دکھا ایسی جھلک
عکس جس عالم کا ہے اُس دیدۂ بیخواب میں

زندگی کے ساغروں میں منتقل کردے انھیں
گردشیں طوفان نے دیکھی ہیں جو گرداب میں

جوش اُبھرنے کا ہو کاش اتنا ہی اہلِ عصر میں
جس قدر پیہم چمک ہے کرمکِ شب تاب میں

کاش اِتنی ہی تڑپ جذبات میں پیدا کریں
جس قدر دریا کی موجوں میں ہے یا سیماب میں

مشکلیں اِسطرح حل ہوتی ہیں جوشِ عزم سے
بہہ نکلتی ہیں چٹانیں جسطرح سیلاب میں

گرچہ دل ٹھنڈے ہوں تاہم اُن میں بھر سکتی ہے یہ
پھیلنے کی ہے جو قوت چادرِ مہتاب میں

دل کو گرمائیں تو ہر ذرّے سے اُس کے ہو عیاں
جو حرارت ہے شعاعِ مہرِ عالمتاب میں

وہ طبیعت مردہ ہے، پژمردہ ہے، جس میں نہ ہو
تازگی جو سبزہ میں ہے، یا گلِ شاداب میں

("مکتبہ" جلد ۱- نمبر ۱- اپریل ۱۹۲۸ء)

بادِ صبا

کہتی ہے بادِ صبا صحرا میں جب آتی ہوں میں
سبز مخمل کا بچھونا سا بچھا جاتی ہوں میں

صحنِ گلشن میں اگر رکھتی ہوں میں آکر قدم
کھلتی پھولوں سے ہوں غنچوں کو بہلاتی ہوں میں

سیر کرنے کو نکلتی ہوں میں اکثر صبحدم
نوجوانانِ گلستاں کو جگا آتی ہوں میں

چھوڑ کر خشکی کو آتی ہوں تری کی سمت جب
موج کے شانے سے زلفِ بحر سلجھاتی ہوں میں

عطر بھر دیتی ہوں میں کلیوں میں چٹکا کر انھیں
اپنی ان تر دستیوں پر آپ اتراتی ہوں میں

جنگلوں میں تند ہو کر کرتی ہوں میں چل بچل بپا
گلشنوں میں ناز سے چلتی ہوں اٹھلاتی ہوں میں

فصلِ گل میں کرتی ہوں میں جب جوانوں پر گذر
عیش کے جذبات کو سینوں میں اکساتی ہوں میں

سبزہ زاروں میں لٹا آتی ہوں شبنم کے گہر
لالہ زاروں میں پہنچکر پھول برساتی ہوں میں

عاشقوں کے کنجِ عزلت میں پہنچتی ہوں اگر
آتشِ غم کو دلوں میں ان کے بھڑکاتی ہوں میں

کر کے روشن شمع پروانے کو دیتی ہوں خبر
گوشِ گل تک نالۂ بلبل کو پہنچاتی ہوں میں

کرتے لاسلکی اشارے ہیں جو یہ اہلِ فرنگ
ساتھ بجلی کے پہنچکر ان کو پھیلاتی ہوں میں

نیم شب میں سرد جھونکے جب گذرتے ہیں مرے
آنکھ اکثر پہرہ داروں کی بھی جھپکاتی ہوں میں

میں درختوں کی رگوں میں دوڑتی ہوں بن کے خوں
نوعروسانِ چمن کا رنگ جھلکاتی ہوں میں

گدگداتی ہوں حسینوں کو میں اکثر صبحدم
چپکے چپکے پاؤں معشوقوں کے سہلاتی ہوں میں

آبشاروں کو سکھاتی ہوں ترنم کوہ پر
ساتھ دے کر ان کا خود بھی ناچتی گاتی ہوں میں

مل کے فواروں کی دھاروں میں اڑاتی ہوں انھیں
چل کے چشموں کے کنارے ان کو چھلکاتی ہوں میں

کر کے طے نیچے پہاڑوں کے پہنچتی ہوں اگر
چوٹیوں سے برف کے تودوں کو پھسلاتی ہوں میں

کرتی ہوں شاداب میں پژمردہ پودوں کو کبھی
تشنہ لب پھولوں پہ شبنم آ کے ٹپکاتی ہوں میں

آتی ہوں جب فصلِ گل میں لے کے پیغامِ بہار
دشتِ عریاں کو لباسِ سبز پہناتی ہوں میں

جب نمازِ صبح کی ہوتی ہیں آوازیں بلند
غافلانِ صبحدم کو آ کے ٹھکراتی ہوں میں

بادِ طوفاں بن کے جاتی ہوں جہازوں پر اگر
ایک عبرت کا تماشا سب کو دکھلاتی ہوں میں

رہگزاروں میں دکھاتی ہوں تماشائے سراب
ریگستاں میں آگ کے شعلوں کو دوڑاتی ہوں میں

عاشق و معشوق کا ہوتا ہے جب وقتِ وداع
اشک کے قطروں کو رخساروں پہ ڈھلکاتی ہوں میں

شاخ جو کملا گئی ہو اس کو کرتی ہوں نہال
آگ جو کجلا گئی ہو اس کو سلگاتی ہوں میں

پھول جو خودرو اگا کرتے ہیں دشت و کوہ میں
ان کی خوشبوؤں سے اک عالم کو مہکاتی ہوں میں

سینچتی ہوں آبِ باراں سے ہزاروں کھیتیاں
جھومتے بادل سمندر سے اڑا لاتی ہوں میں

سرد ہوتی ہوں، پہاڑوں سے گزرتی ہوں اگر
نیّرِ رخشندہ کی کرنوں سے گرماتی ہوں میں

گدگدانے سے مرے ہوتے ہیں طائر نغمہ زن
چھیڑ دیتی ہوں نفیں خاموش اگر پاتی ہوں میں

سانس کے رستے اتر کر جسم حیوانات میں
زندگی کی آگ کو ہر وقت دہکاتی ہوں میں

("الناظر" لکھنؤ۔ جلد ۲۸۔ عدد ۱۶۶۔ عدد ۱۶۷۔ اپریل و
مئی ۱۹۲۵ء۔ صفحہ ۷۶۔ ۷۷)

سمندر کے کنارے

دوپہر کا وقت ہے، چہرہ ہوا کا صاف ہے
شوخ ہیں سورج کی کرنیں، آسماں شفاف ہے

تلملا کر اُٹھتی ہیں موجیں سمندر کی تمام
ناچتی ہیں اور اسی دُھن میں مگن ہیں صبح و شام

دُور سے آتے نظر ہیں کچھ جزیرے نیلگوں
آسماں ہے دیکھ کر حیرت سے جن کو سرنگوں

اِن جزیروں میں پہاڑوں کی جو ہے پھیلی قطار
برف کے تودے ہیں اُن کی چوٹیوں پر بے شمار

دھوپ کا پڑتا ہے اُن پر ارغوانی رنگ جب
دیکھنے والوں کو حسن اُن کا نظر آتا ہے تب

اُٹھتی ہے ہر دم سمندر سے تموج کی صدا
چہچہاتے ہیں پرند، اور سرسراتی ہے ہوا

راگ بنتی ہیں صدائیں، جب یہ ہوتی ہیں بہم
مست ہو کر ناچتا ہوں سُن کے میں یہ زیر و بم

اُٹھتی ہیں مل مل کے موجیں اور بکھر جاتی ہیں وہ
سطحِ پر تاروں کی اک بارش سی کر جاتی ہیں وہ

ریت پر بیٹھا ہوں میں تنہا، عجب مستی میں ہوں
ہوں جو از خود رفتہ، گویا اک نئی ہستی میں ہوں

دور آبادی سے ہوں میں، یہ جگہ سنسان ہے
جلوہ گر قدرت کی اس جا اک نرالی شان ہے

صاف منظر ہے، نہیں اُڑتا حسد کا یاں غبار
کوئی دل یاں ہو نہیں سکتا ہے غم سے بیقرار

بغض و کیں کی یاں نہیں چلتی ہوائے دلخراش
اور تعصب کر نہیں سکتا دلوں کو پاش پاش

یاں مسرت ہی مسرت ہے، نہیں غم کا گذر
نورِ آزادی کا یاں چاروں طرف ہی جلوہ گر

ہے ہوا آزاد، اور موجیں یہاں آزاد ہیں
سب پرند آزاد ہیں، سب مچھلیاں آزاد ہیں

حُسن لیتا ہے یہاں لہریں، پڑا چاروں طرف

ہے ہے روشنی چاروں طرف اور ہے ضیا چاروں طرف

کیا سمندر پر کھلائے ہیں یہ قدرت نے چمن
ہے یہ لہروں کی سبھا، وہ بلبلوں کی انجمن

مچھلیاں کرتی ہیں پانی میں اِدھر اٹھکھیلیاں
ہیں اُدھر طائر ہوا پر کس مزے سے نغمہ خواں

جس طرف دیکھو وا قدرت کی زنگار رنگ ہے
حسن ہے یا عیش ہے یا راگ ہے یا رنگ ہے

جس طرف دیکھو، نیا جلوہ، نئی اک دھوم ہے
بستیوں میں جو ہے وہ اس لطف سے محروم ہے

لیکن اِس جا بستیوں والے جو مل کر آئینگے
لُطف آزادی کے یہ سب خاک میں مِل جائینگے

("تصویرِ مناظر" جلد دوم صفحہ ۴۸)

ذوقِ عمل

۱۹۲۵ء میں حالی مسلم ہائی سکول پانی پت سے میرے زیرِ اہتمام ایک ماہنامہ "مشعل" کے نام سے جاری ہوا تھا۔ یہ نظم اُس کے لئے خاص طور پر مولانا نے مجھے حیدرآباد سے بھیجی تھی۔ (اسماعیل)

اُن کے دل پر، دل کو جو بے چین کر سکتی نہیں
انقلابِ دہر کے صدمے گذر سکتے نہیں

جن کی شخصی زندگی ہے عین قومی زندگی
اُن کو جینے کا سلیقہ ہے وہ مر سکتے نہیں

پستیِ فطرت سے جو رہتے ہیں اکثر خود غرض
نقش اُن کے امتیازوں کے اُبھر سکتے نہیں

جن کا دل پاکیزہ ہے، جن کا چلن ہے آبدار
وہ عزیزوں کی نگاہوں سے اُتر سکتے نہیں

جو امانت میں رہے سچے، دیانت میں کھرے
ہاتھ اُن کے چھوٹے ہو کر بھی اُتر سکتے نہیں

جو مصیبت کے بھنور سے دور ساحل پر رہیں
گوہرِ مقصد سے وہ دامن کو بھر سکتے نہیں

اجتماعِ قوم سے جن کو رہی اُلفت سدا
ہوش اُن کے وقتِ کلفت بھی بکھر سکتے نہیں

جن کے چہروں پر کدورتِ دل کی ہو چھائی ہوئی
رنگ غازوں سے کبھی اُن کے نکھر سکتے نہیں

جو خفا تہذیب سے ہوں جن کی عادت ہو جفا
سامنے اہلِ وفا کے وہ ٹھہر سکتے نہیں

گھر کی بگڑی تربیت نے کر بگاڑا ہو جنھیں
مدرسوں میں جا کے تم ہرگز سنور سکتے نہیں

زندگی ہو جن کی آوارہ، پریشاں ہو نظر
منزلِ مقصد پہ وہ زنہار اُتر سکتے نہیں

جن کے باطن میں نہ اُتری ہو حقیقت کی شعاع
اہلِ باطن سے وہ آنکھیں چار کر سکتے نہیں

اہلِ دُنیا سے کریں کیوں زندگی لڑ کر تباہ
ہم کوئی دُنیا نئی آباد کر سکتے نہیں

عمر کے کچھ دِن تو ہم صلح و صفا میں کاٹ دیں
ورنہ جھگڑے عمر بھر کے ختم کر سکتے نہیں

آخرت کے کام جو کر جائیں اپنے وقت پر
سچ تو بس یہ ہے کہ وہ بے وقت مر سکتے نہیں

برچھیوں کے زخم بھر جاتے ہیں پر اے طعنہ زن!
مرتے دم تک بھی زباں کے زخم بھر سکتے نہیں

سرد مہری سے ذرا بچنا کہ یہ پالا ہے وہ
جس سے یہ اخلاق کے پودے اُبھر سکتے نہیں

یہ بھی کیا تعلیم ہے، مذہب سے رہنا بے نیاز
سرکشی ایسی کہ گویا سجدہ کر سکتے نہیں

ہو بھنور درپیش جن کو ترکِ مذہب کا سلیم
کشتیِ تہذیب میں وہ پار اُتر سکتے نہیں،

اُمّید کی کرن

خاتمہ تیرا اب اے ظلمتِ ہجراں ہوگا
صبحِ اُمّید کا پھر جلوہ نمایاں ہوگا

منتظرِ شاہدِ مقصود کی مدت سے نگاہ
شعلۂ برق اسی تار پہ رقصاں ہوگا

طیش میں اشک کا جو قطرہ گرا دامن پر
اسی قطرے سے بپا عیش کا طوفاں ہوگا

خاک میں تخمِ تمنا جو دبایا تھا کبھی
اب وہی تخم نمو پا کے گلستاں ہوگا

زیرِ خاکسترِ پروانہ جو پنہاں تھا شرر
پھر بھڑک کر وہی اب شمعِ شبستاں ہوگا

جس سے اٹھتا نظر آتا تھا شبِ غم کا دھواں
مطلعِ صبح وہی چاکِ گریباں ہوگا

پارۂ سنگ نے جھیلی ہے شعاعِ خورشید
اب بدل کر وہی اک لعلِ بدخشاں ہوگا

خوں جس پنجۂ مژگاں سے ٹپکتا تھا کبھی
خوشنمائی سے وہ اب پنجۂ مرجاں ہوگا

پہلے جس دشت پہ پھیرا تھا اداسی نے قلم
اب وہی تختۂ مشقِ گل و ریحاں ہوگا

سیل جس دامنِ کہسار پہ رویا برسوں
اب وہی جوشِ گل و لالہ سے خنداں ہوگا

رہ چکا زردِ جمالِ رُخِ کنعاں جس میں
گلشنِ مصر وہی گوشۂ زنداں ہوگا

قطرۂ نیساں کا تھا گرداب میں گرنے والا
سیپ میں جا کے وہ اک گوہرِ غلطاں ہوگا

آگ جلتی کبھی دیکھی نہیں جس قلعے پر ۔۔۔ اب وہی برقِ تجلی سے درخشاں ہوگا
جس میں پالے نے نہ چھوڑا اثرِ نشو و نما ۔۔۔ اب وہی نخلِ ثمر ریز و گل افشاں ہوگا
جس میں تھا اُمتِ موسیٰ کو ٹھہرنا مشکل ۔۔۔ من و سلویٰ کا اُسی دشت میں ساماں ہوگا
کل سکندر تھا اندھیرے میں جہاں سرگرداں ۔۔۔ موج زن آج وہیں چشمۂ حیواں ہوگا
خاک اُڑاتا تھا جہاں غولِ بیاباں کا گروہ ۔۔۔ گرم پرواز وہیں تختِ سلیماں ہوگا
جس شبستاں پہ نشۂ جہل کا چھایا تھا کبھی ۔۔۔ اب وہی خمکدۂ حکمتِ یوناں ہوگا
پہلے اُٹھتے تھے جہنم کے شرارے جس جا ۔۔۔ اب وہیں جلوہ نما گلشنِ رضواں ہوگا
ظلمتِ فصلِ خزاں چھائی تھی جس مسکن پر ۔۔۔ اب وہ پھولوں کی تجلی سے چراغاں ہوگا
جلوۂ شاہدِ مقصود جو تھا زیرِ نقاب ۔۔۔ روبرو چشمِ تماشا کے وہ عریاں ہوگا
یاس کی نیند سے اُٹھے گا جو آنکھیں ملتا ۔۔۔ صبحِ اُمید کے جلوہ سے وہ حیراں ہوگا

پرسماں دیکھ کے ہر غمزدہ مانندِ سلیم
وجد میں آکے مسرت سے غزل خواں ہوگا

علی گڑھ میگزین۔ جلد ۴۔ نمبر ۳۔ اکتوبر و نومبر ۱۹۲۶ء۔ صفحہ ۵-۶

نگاہِ حقیقت

حیرت میں ہے نگاہ جدھر دیکھتا ہوں میں
آئینہ خانہ پیشِ نظر دیکھتا ہوں میں

اِک آرزو نے ڈال دی ہلچل کہ ناگہاں
دُنیائے دل کو زیر و زبر دیکھتا ہوں میں

تیری نگاہِ لطف تماشا دِکھا گئی
دُنیا و دیں کو شیر و شکر دیکھتا ہوں میں

اُلٹے گا ایک دن یہ تمناؤں کا جہاں
ثبت اپنے قلب پر یہ خبر دیکھتا ہوں میں

ناکامیوں کا پردہ اُلٹتا ہوں جب کبھی
روئے عروسِ فتح و ظفر دیکھتا ہوں میں

ہوں جب سے غرق تیرے کرم کے خیال میں
بحرِ جہاں کو تا بہ کمر دیکھتا ہوں میں

بخشی ہیں میرے ذرّے کو تو نے وہ رفعتیں
سجدہ میں آفتاب کا سر دیکھتا ہوں میں

سورج کی زد میں گرچہ فنا کا یقین ہے
شبنم کو پھر بھی سینہ سپر دیکھتا ہوں میں

دیکھوں میں تیرا جلوۂ بے رنگ کس طرح
نیرنگیوں کا دل پہ اثر دیکھتا ہوں میں

دل سے کہیں آفتاب کے اُٹھنے کا وقت ہے
رگ رگ میں اپنے نورِ سحر دیکھتا ہوں میں

میں خوب دیکھتا ہوں، کدھر دیکھتے ہو تم،
تم دیکھتے نہیں کہ کدھر دیکھتا ہوں میں

مزدور کو یہ ایک مبصر نے دی صدا
محنت کے سنگریزوں میں زر دیکھتا ہوں میں

کس بام پر ہے مُرغِ تخیل کا اب گذر — لرزیں جبرئیل کا پر دیکھتا ہوں میں
کن کن بتوں کو سجدہ کیا تیرے سامنے — پیشانی اپنی شرم سے تر دیکھتا ہوں میں
دولت کی بستیوں سے ہے ہستی تری بعید — اُجڑے دلوں میں تیرا گذر دیکھتا ہوں میں
زر کو غرورِ زر نے دی یہ زور سے صدا — خرمن میں تیرے رقصِ شرر دیکھتا ہوں میں
چھوٹے نہ بندگی کہیں دامن خدائی کا — معراجِ ارتقائے بشر دیکھتا ہوں میں
آنکھیں کھلیں نہ دل کی اِن آنکھوں کے ساتھ حیف — کچھ دیکھتا نہیں ہوں اگر دیکھتا ہوں میں
یہ خاکِ مفلسی میں جو ذرّے چمکتے ہیں — پوشیدہ اُن میں شمس و قمر دیکھتا ہوں میں
رگ رگ میں ہے شریف کی نہرِ لبن رواں — حاسد کے دل میں نارِ سقر دیکھتا ہوں میں
کرتا ہے منع دِل کو پریشاں نگاہی سے — شاید نہ رک سکے وہ مگر دیکھتا ہوں میں
محنت بدلنے والی ہے راحت سی بیگماں — خونِ جگر برنگِ دِگر دیکھتا ہوں میں
ہر پھر کے ایک نقطہ پہ آتی ہے ہر نگاہ — بحرِ جہاں کو ایک بھنور دیکھتا ہوں میں

ڈھونڈوں کہاں تجھے کہ تری جلوہ گاہ میں
اُٹھتا ہوا غبارِ نظر دیکھتا ہوں میں

اے مطلعِ عثمانیہ کالج کے ستارو!

(مولانا سلیم نے یہ نظم اُس وقت پڑھی تھی جب قامت خانۂ قدیم کلیہ جامعہ عثمانیہ کی مجلسِ مباحثہ کے نئے نئے قواعد بنائے گئے تھے۔ اور جدید نظام پر عمل شروع کرنے کے لئے از سرِ نو محفلِ مباحثہ کا افتتاح ہوا تھا ۔)

آتی ہے نظر آج مسرّت سے بھری شام
جلوہ سے مسرّت کے منوّر ہیں در و بام

عثمانیہ کالج کے یہاں جمع ہیں فرزند
تقریب کچھ ایسی ہے کہ دل سب کے ہیں خورسند

کہتے ہیں کہ ہے بحث کی مجلس کا پھر آغاز
قالب ہے نیا اس کا، نئی اُس کی ہے پرواز

سچ یہ ہے کہ مجلس ہے جوانوں کی یہ ہادی
مجلس یہ بتاتی ہے، اُخوت کے مبادی

اُلفت کا سبق ہے یہ عزیزوں کو سکھاتی
مجلس یہی وحشی کو ہے انسان بناتی

جولانگہِ اظہارِ لیاقت اسے کہیے
گہوارۂ تعلیمِ فصاحت اسے کہیے

ذہنوں کی ترقی کا جو میدان ہے تو یہ ہے
آدابِ تمدن کا دبستان ہے تو یہ ہے

سانچے میں ہیں اخلاق اسی تعلیم سے ڈھلتے
تہذیب کے چشمے ہیں اسی جا سے اُبلتے

سمجھو کہ غنیمت ہے یہ مجلس مری جانو!
گذرے جو یہاں وقت، غنیمت اُسے جانو

بھائی ہو تم آپس میں، نہ بھولو یہ سبق تم
گویا کہ ہو بس ایک صحیفہ کے ورق تم

اقرارِ وفا کر کے ، مکرنا نہ ، خبردار!
تسبیح کے دانے ہو، بکھرنا نہ خبردار!

تقریر جو کرنا، تو دل آزار نہ کرنا | تلوار کا بھائی پہ کبھی وار نہ کرنا
آدابِ شرافت سے گذرنا نہ جوانو! | غصہ بھی گر آئے تو بپھرنا نہ جوانو!
ایسا نہ ہو اغیار کریں شور یہ برپا | یاروں میں نظر آتا ہے اغیار کا نقشا
عثمانیہ کالج کے جگر بند ہیں کیسے؟ | اس مادۂ علمی کے یہ فرزند ہیں کیسے؟
ہاں دیکھنا، عزت پہ نہ داغ آئے تمھاری | ہو جاؤ نہ تم زیورِ اخلاق سے عاری
تیزی سے قدم علم کے میداں میں بڑھاؤ | سرگرمی و ہمت سے نہ جی اپنا چراؤ
قوموں میں اُسی قوم کا روشن ہے ستارا | جس نے کہ قدم علم کے میداں میں ہے مارا
ملکوں میں اُسی ملک کی عظمت ہے مُسلّم | جس ملک کے سر پر ہے اُڑا علم کا پرچم
گر چاہتے ہو گرُ کے تنزل سے اُبھرنا | لازم ہے تمھیں علم کے دنگل میں اُترنا
اے مطلعِ عثمانیہ کالج کے ستارو! | ہمت نہ کبھی علم کی تحصیل میں ہارو
تھے علم میں مشہور جو اسلاف تمھارے | وہ عالمِ بالا سے یہ کرتے ہیں اشارے
چمکے گی اسی علم سے تقدیر تمھاری | یہ ملک تمھارا ہے، یہ جاگیر تمھاری

آخر میں دُعا ہے کہ خداوندِ دو عالم
ہمت کو تمھاری کرے اِس راہ میں مُحکم

(''مجلۂ عثمانیہ'' جلد ۱۔ نمبر ۱۔ فروری ۱۹۲۷ء۔)

میں کیا کیا کرتا رہا

دل جو رازِ خامشی مجھ پر عیاں کرتا رہا
میں زبانِ بے زبانی سے بیاں کرتا رہا

حسن رنگ رنگ سے تری جنت عیاں کرتا رہا
میں تماشائے بہارِ کن فکاں کرتا رہا

چار تنکوں کا ہوں میں مالک مگر جرأت تو دیکھ
انتظارِ جلوۂ برقِ تپاں کرتا رہا

جستجو تھی تیرے حسنِ عرش منزل کی مجھے
اپنی ہستی کو غبارِ کہکشاں کرتا رہا

یارب اپنے دل سے میں دوزخ اُگلتا تھا مگر
تو اُسے اکثر بہشتِ جاوداں کرتا رہا

وائے نادانی کہ جب چمکی ترے غصے کی دھوپ
میں سیہ نامے کو اپنے سائباں کرتا رہا

مجھ سے پوچھے کوئی تیرے حسن کی نیرنگیاں
جو تری خاموشیوں کو نغمہ خواں کرتا رہا

دو قدم پر عشق کو لیلیٰ کا محمل مل گیا
فلسفہ برسوں تلاشِ کارواں کرتا رہا

زندگی کی مشکلِ لاینحل اُس نے حل نہ کی
علم اب تک طے ہزاروں ہفتخواں کرتا رہا

دل کا دعویٰ تھا کہ چھوڑونگا نہ دامن صبر کا
پر فراموش اُسکو وقتِ امتحاں کرتا رہا

صاحبانِ ہمتِ عالی جہاں مدفون تھے
اُس زمیں کی سیر اکثر آسماں کرتا رہا

تیرے اس اعجاز پہ صد آفریں اے ضبطِ عشق
تو مرے ہر قطرہ میں دریا نہاں کرتا رہا

حُبِّ دنیا نے کچھ ایسا مجھ پہ پھونکا ہے فسوں
دین کو میں محوِ سود و زیاں کرتا رہا

پہنچی ہے شبنم جہاں گل پر شعاعِ مہر کے
میں عروج اُس بام پر بے نردباں کرتا رہا

("نئی زندگی" جہلم - ۲۳ ستمبر ۱۹۳۲ء)

گردشِ ایّام کا مطالعہ

دیکھے ہیں گردشِ ایام کے دفتر میں نے	پلٹتے تاروں کے بدلتے ہوئے تیور میں نے
میں نے دیکھا ہے ابھرتی ہوئی تقدیروں کو	ڈوبتے دیکھے ہیں اقبال کے اختر میں نے
میں نے پھنستی ہوئی چڑیوں کی سُنی ہے فریاد	ٹوٹتے دیکھے ہیں شہبازوں کے شہپر میں نے
سبزہ پر دیکھے ہیں شبنم کے بکھرتے آنسو	مسکراتے ہوئے دیکھے ہیں گُلِ تر میں نے
دار سے زندہ اُترتے مجھے آئے ہیں نظر	دیکھے ہیں حلق پہ چلتے ہوئے خنجر میں نے
بے زبانوں کو فصاحت کا شناسا پایا	گُنگ ہوتے ہوئے دیکھے ہیں سخنور میں نے
ڈوب کو خاک میں دب دب کے اُبھرتے پایا	گرتے دیکھے ہیں درختانِ تناور میں نے
بستیاں ڈوبتی سیلاب میں دیکھیں اکثر	خشک ہوتے ہوئے دیکھے ہیں سمندر میں نے
سنگ پاروں کو خزانوں میں مزین دیکھا	خاک میں ملتے ہوئے پائے ہیں گوہر میں نے
مرد بنتے ہوئے نامردوں کو دیکھا اکثر	لوٹتے خاک پہ دیکھے ہیں دلاور میں نے
سائلوں کو درِ دولت پہ نگہبان دیکھا	ہاتھ پھیلائے ہوئے پائے تونگر میں نے

تیشناؤں کو تلاطم سے نکلتے دیکھا　　غرق ہوتے ہوئے دیکھے ہیں شناور میں نے
رنگ مرجھائے ہوئے پھولوں کا چڑھتے دیکھا　　دیکھے آئینوں سے جھڑتے ہوئے جوہر میں نے
مسجدیں بنتی کلیسا نظر آئیں مجھ کو　　دیکھے مسجد سے بدلتے ہوئے مندر میں نے
مجھ کو جنگل میں سماں آیا ہے منگل کا نظر　　سوگ دیکھا ہے شبستانوں کے اندر میں نے
کام بنتے ہوئے دیکھے ہیں بہت سے تدبیر　　کبھی دیکھے ہیں اُلٹتے ہوئے منتر میں نے
تخت شاہی پہ گداؤں کو مسلط دیکھا　　بھاگتے دیکھے ہیں افرادِ سکندر میں نے
ٹمٹماتی ہوئی شمعوں کو لگتے دیکھا　　اُلٹے دیکھے ہیں چھلکتے ہوئے ساغر میں نے
وہ زمیں جس پہ نجاست کے تھے انبار اُسکو　　دیکھا بنتے ہوئے گلزارِ معطر میں نے
اُن مقامات میں جو عیش و طرب کے تھے محل　　دیکھے اُٹھتے ہوئے ہنگامۂ محشر میں نے
بہتی دیکھی تھی جہاں موجِ نسیمِ اقبال　　پائی چلتی ہوئی ادبار کی صرصر میں نے
پہلے اُٹھتے تھے جہنم کے شرارے جس جا　　بہتے دیکھے ہیں وہاں چشمۂ کوثر میں نے
اپنے چہروں کی صفا دیکھتے تھے جنمیں حسین　　اُنھیں آئینوں کو پایا ہے مکدر میں نے
جن کے افراد میں تھا رشتۂ اُلفت محکم　　پایا اُس مجمعِ احباب کو ابتر میں نے
جس کی اِک اینٹ بھی یاجوج سے ہل سکتی نہ تھی　　دیکھی ہے ٹوٹتی وہ سدِ سکندر میں نے
جن کو مزدوروں کی ٹولی میں نہ ملتی تھی جگہ　　اہلِ سرمایہ کا پایا انھیں ہمسر میں نے

جن کا بڑھنا تھا نہ منزل میں ترقی کی قدم　　اُن کا چڑھتا ہوا دیکھا ہے مقدر میں نے
درِ قیصر پہ نہ ملتا تھا جنھیں بار کبھی　　اُن کو اب پایا ہے ہمپایہ قیصر میں نے
اُن پہ گرتی ہوئی بجلی مجھے آئی ہے نظر　　جن کا گھر پایا ہے بجلی سے منور میں نے
پایا ہے فطرت و ہمت کو جھگڑتے باہم　　دیکھی تدبیر سے تقدیر کی ٹکر میں نے
پایا ہے میں نے بگڑتوں کو یکایک بنتے　　دیکھا بنتوں کو بگڑتے ہوئے اکثر میں نے
ہیر پھیر ایسے نظر آئے ہیں مجھ کو پیہم　　ایسی تبدیلیاں دیکھی ہیں مکرر میں نے

نظر آئے ہیں تغیر کے تماشے مجھ کو
انقلابوں کے بہت دیکھے ہیں منظر میں نے

("نئی زندگی" جہلم۔ ۹ ستمبر ۱۹۳۲ء)

تخیّل کے کرشمے

(۱)

ایک شب بند تھا میں گوشۂ تنہائی میں — زلزلہ سا تھا مرے قصرِ شکیبائی میں
ابرِ غم تھے اُفقِ دل پہ مرے چھائے ہوئے — سر پہ تھے صاعقے آفات کے منڈلائے ہوئے
میری قسمت بسرِ جنگ نظر آتی تھی — زندگانی کی فضا تنگ نظر آتی تھی
ایک ہنگامہ تھا برپا مرے ارمانوں میں — برقِ مضطر کی تڑپ تھی مری شریانوں میں
صرصرِ رنج کے جھونکے جو گذر جاتے تھے — دفترِ قلب کے اوراق بکھر جاتے تھے
تھا سفینہ مرا طوفانِ حوادث میں رواں — خوف تھا یہ کہ نہ ہو جائے تلاطم میں نہاں
بن کے گرداب ڈراتے تھے غم و یاس مجھے — نظر آتے تھے نہنگانِ قضا پاس مجھے

(۲)

اک فرشتہ سا یکایک نظر آیا مجھ کو — رُخِ پُر نورِ تخیّل نے دکھایا مجھ کو
پیکرِ نور سے اُس کے مجھے آئی یہ صدا — میں ہوں اِس وادیٔ ظلمت میں ترا راہنما
کھول کر آنکھ ذرا، عالمِ ایجاد کو دیکھ — دامنِ دشت میں پھر گُلشنِ شداد کو دیکھ

اب نہ طوفاں، نہ گھٹا ہے، نہ بھنور پڑتے ہیں — نہ تباہی کے وہ ہنگامے نظر پڑتے ہیں
ہے فضا سامنے سرسبز تمناؤں کی — جنتیں کھیلتی ہیں گود میں صحراؤں کی
بہتے ہیں ریگِ رواں میں یونہی چشمے میرے — ابھی دیکھے ہیں کہاں تو نے کرشمے میرے

(۳)

میں نے یہ سنتے ہی پردے سے اُلٹتے دیکھے — یاس و حرماں کے جو بادل تھے وہ پھٹتے دیکھے
شبِ تاریک کی پسپائی نظر آئی مجھے — مہ پہ انجم کی صف آرائی نظر آئی مجھے
چاند کو ڈوب کے بادل سے نکلتے دیکھا — نور کو چشمۂ ظلمت سے اُچھلتے دیکھا
دشتِ ویراں میں چمن زار مہکتے دیکھے — مرغ فردوس کی شاخوں پہ چہکتے دیکھے
کشتیاں ریگ کے سیلاب میں چلتی دیکھیں — بجلیاں گود میں خاشاک کی پلتی دیکھیں
ذرّے بنتے ہوئے خورشیدِ درخشاں دیکھے — معجزے میں نے تخیل کے نمایاں دیکھے
نظر آیا جو یہ منظر کا نیا رنگ مجھے — اِس طرب خیز تماشے نے کیا دنگ مجھے
کی تخیل کے فرشتے پہ تحیر سے نظر — پھر کہا اُس سے کہ اے مایۂ بہبودِ بشر!
کیا ہے رتبہ ترا، کیا شان ہے، کیا دھن ہے تری؟ — کس لیے محفلِ عالم میں یہ سن گن ہے تری؟

(۴)

ہنس کے فرمایا کہ اے بےخبرِ رازِ ازل! — ہے مجھی سے یہ دو عالم کی فضا میں ہل چل

ہے دلوں اور دماغوں میں حکومت میری — دین و دُنیا پہ ہے چھائی ہوئی وسعت میری
انبیا کے لئے اِک محرم و دمساز تھا میں — اُن کے خلوت کدۂ عشق کا ہمراز تھا میں
انبیا ہی نہیں کچھ ناز اُٹھاتے ہیں مرے — فلسفی جتنے ہیں، اوصاف وہ گاتے ہیں مرے
میں نے قدرت کے معمے ہیں سکھائے انکو — راز جو عقل سے پنہاں تھے بتائے ان کو
تھیں سب اُلجھی ہوئی اس نظمِ جہاں کی لڑیاں — میں نے زنجیر کی سب کھول کے رکھدیں کڑیاں
سلسلے علت و معلول کے کھولے میں نے — کلیے عقل کی میزان میں تولے میں نے
شاعروں نے جو کرشمے مرے عُریاں دیکھے — پھولتے پھلتے تصور کے گلستاں دیکھے
حُسن کے اُن کو جو نیرنگ دکھائے میں نے — باغِ فطرت کے نئے رنگ دکھائے میں نے
رُخ جو میں اُن کے تصور کا پلٹ دیتا ہوں — پردے اسرارِ تجلی کے اُلٹ دیتا ہوں
زمزمے عشق و محبت کے سُناتا ہوں انھیں — طائفے رقص میں پریوں کے دکھاتا ہوں انھیں
زندگی کے کبھی اسرار بتائے میں نے — کبھی جذبات کے ہنگامے دکھائے میں نے
پھونکتا روح ہوں جب نثر کی تحریروں میں — رنگ بھرتا ہوں خیالات کی تصویروں میں
جس کو کہتے ہیں ادب ہے وہ گلستاں میرا — اس کی رنگینیوں میں حُسن ہے عُریاں میرا
ہیں ادیبوں کی زبانوں پہ ترانے میرے — یاد ہیں سحر نگاروں کو فسانے میرے
نظم میں زمزمہ کرتی ہیں اُمنگیں میری — نثر میں ناچتی پھرتی ہیں ترنگیں میری

جو ہیں مایوس انھیں غم سے چھڑاتا ہوں میں	گلشن سبز تمنا کا دکھاتا ہوں میں
تازگی میں دل افسردہ کو پہنچاتا ہوں	زندگی مردہ خیالات میں دوڑاتا ہوں
دم مرا درد کی تدبیر شفا کرتا ہے	سنگ پارس مرا آہن کو طلا کرتا ہے
روح انساں کی تگ و دو پہ ہے قابو میرا	مسمریت کے کرشموں میں ہے جادو میرا

الغرض اپنے کمالات پہ ہے ناز مجھے
دی ہے خالق نے عجب قوتِ اعجاز مجھے

(رُوحِ نظم۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۱۲۹ تا ۱۳۱)

آئندہ کا خواب

رازِ آئندہ کے عُریاں نظر آتے ہیں مجھے
اک نئی جنگ کے ساماں نظر آتے ہیں مجھے

آنے والے ہیں جو ہنگامے قیامت انگیز
پردۂ غیب میں پنہاں نظر آتے ہیں مجھے

کئی قوموں کا چھلکنے کو ہے پیمانۂ عمر
ٹوٹتے شاہوں کے پیماں نظر آتے ہیں مجھے

پھر افق پر نظر آتی ہے کدورت کی گھٹا
اُٹھتے پھر غیظ کے ساماں نظر آتے ہیں مجھے

نظر آتے نہیں آرام و سکوں کے آثار
لرزہ میں دہر کے ارکاں نظر آتے ہیں مجھے

سرکشی دیکھ کے افرادِ بشر کی باہم
مَلک انگشت بدنداں نظر آتے ہیں مجھے

عقلیں اب امن کی تدبیر سے عاجز ہیں تمام
فلسفے سر بگریباں نظر آتے ہیں مجھے

سب یہ اُس جنگ کا آغاز جسے دیکھ کے اب
دیوتا جنگ کے حیراں نظر آتے ہیں مجھے

کرتے ایجاد ہیں اس کے لئے سامان نئے
اپنی عقلوں پہ جو نازاں نظر آتے ہیں مجھے

آگ اُگلنے کو تفنگوں نے دہن کھول دیئے
خوں فشاں خنجرِ بُرّاں نظر آتے ہیں مجھے

قتلِ انساں کے لئے دوڑتی ہے برق کی رَو
گیس کے بُقّے پریشاں نظر آتے ہیں مجھے

مُنہ میں توپوں کے کُھلے چرخِ بریں کی جانب
صاعقے ابر میں رقصاں نظر آتے ہیں مجھے

غول طیاروں کے افلاک کی جانب ہیں رواں — گرتے اب قلعہ و ایواں نظر آتے ہیں مجھے

بم پہ بم گرتے ہیں، ہیبت ہے جہاں پر طاری — در و دیوار بھی لرزاں نظر آتے ہیں مجھے

بال و پر طائروں کے اوج ہوا پر ہیں کباب — خاک پر لوٹتے انساں نظر آتے ہیں مجھے

آگ ہی آگ ہے پھیلی جدھر اُٹھتی ہے نظر — شعلہ زن شہر و بیاباں نظر آتے ہیں مجھے

لہلہاتے ہوئے جو کھیت تھے جنگل میں کھڑے — آتش جنگ میں سوزاں نظر آتے ہیں مجھے

محفلیں عیش و طرب کی ہوئیں برہم ساری — خاک کے ڈھیر شبستاں نظر آتے ہیں مجھے

باغ جنت نظر آتے تھے مسافر کو جہاں — اب وہ سب مرحلے ویراں نظر آتے ہیں مجھے

جن مکانوں میں بھرے عیش کے ساماں تھے تمام — اب وہ سب بے سر و ساماں نظر آتے ہیں مجھے

زیب تن جو کبھی کرتے تھے سنہری پوشاک — بچے اُن شاہوں کے عُریاں نظر آتے ہیں مجھے

جن مقامات میں جمگھٹ تھے امیروں کے کبھی — اب وہ سب گورِ غریباں نظر آتے ہیں مجھے

جن کو اربابِ حشم نے کبھی ٹھکرایا تھا — محتشم اب وہی دہقاں نظر آتے ہیں مجھے

خال خال اب کہیں باقی ہیں ستمگار اگر — ظلم سے اپنے پشیماں نظر آتے ہیں مجھے

فتنہ پردازیاں تھیں جن کی جبلت میں بھری — اب وہی امن کے خواہاں نظر آتے ہیں مجھے

جس مساوات کی کرتے تھے تمنا اسلاف — اُس کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں مجھے

خود پرستی کے جہاں دوڑتے رہتے تھے سمند — حُرّیت کے وُہی میداں نظر آتے ہیں مجھے

اپنی قوت پہ جو مغرور تھے بیداد سرِ خوش
اب وہی حق کے نگہباں نظر آتے ہیں مجھے

حُبِّ انساں کی ضیا جن کے دلوں میں ہے بھری
چہرے اُس قوم کے تاباں نظر آتے ہیں مجھے

مہر و الفت کا جو سب نورِ جہاں میں پھیلا
اُس سے آفاق درخشاں نظر آتے ہیں مجھے

عدل و انصاف کی دنیا میں پھر آئی ہے بہار
جس سے معمور گلستاں نظر آتے ہیں مجھے

حال پر جن کے بہاتی رہی شبنم آنسو
اب شگوفے وہی خنداں نظر آتے ہیں مجھے

وہ چمن جن پہ خزاں پھیر چکی تھی پانی
اب سراپا گل و ریحاں نظر آتے ہیں مجھے

بیٹھتے تھے کبھی کوے بھی نہ جن شاخوں پر
اُن پہ مرغانِ خوش الحاں نظر آتے ہیں مجھے

جو مقامات کہ اس جنگ میں دوزخ تھے بنے
اب وہی گلشنِ رضواں نظر آتے ہیں مجھے

دوڑتی ضو جو محبت کی ہے بجلی کی طرح
سینے اس ضو سے فروزاں نظر آتے ہیں مجھے

مختلف مذہب و ملت کے جوانانِ حسیں
سبزہ زاروں میں خراماں نظر آتے ہیں مجھے

یہ سماں نور کا آیا جو تصور میں نظر
دیدۂ و دل بھی چراغاں نظر آتے ہیں مجھے

("تصویرِ جذبات" حصہ دوم صفحہ ۵۸)

جذبۂ ایمان

بندِ اوّل

قیامت خیز جذبہ ہے، بلندی کا جو پستوں میں
تو کیسی کھلبلی برپا ہے، ان باطل پرستوں میں،
یہی ہمت ہے گر فرشِ زمیں پر رہنے والوں کی
تو جا پہنچیں گے بامِ عرش پر دو چار دستوں میں
تڑپنے میں ہے مظلوموں کے پنہاں، تم یقیں جانو
وہی طاقت، نظر آتی ہے جو نوجوں کے دستوں میں
حوادث بادو باراں کی طرح آکر گزر جائیں
پہاڑوں کی توانائی بھری ہے زیر دستوں میں
قدم رکھتے ہی اُڑ جائیں گے اہلِ جبر چھو ہو کر
سُرنگیں صبر نے اُن کے بچھادی ہیں وہ رستوں میں
شکستیں کھائی ہیں مشرق نے مغرب سے بہت لیکن

چھپا بیداریٔ مشرق کا نقشہ راز ان شکستوں میں
قریب آیا ہے شاید وقت ہشیارانِ غرب کا
کہ اک طوفانِ محشر ہے بپا غفلت کے مستوں میں
نہیں ممکن کہ یہ آندھی تھمے، اور تھم کے رہ جائے
در و بام یہاں پر گردشِ اک جم کے رہ جائے

بندِ دوم

مسلماں تھے جو سوئے غفلتوں کی چادریں تانے
ہلائے گردشِ ایام نے اُن کے بھی اب شانے
اُمنگیں جن کی بجھ کر رہ گئی تھیں یاس و حرماں سے
لگی پھر آتشِ غیرت دلوں کو آن کے گرمانے
صدا ہاتف نے دی اُن کو کہ "اے توحید کے مستو!
یہ کیوں آبادِ مغرب میں ہیں گمراہی کے میخانے
مساواتِ اسود و احمر ہیں یہ رکھتے نہیں جائز
عدالت سے ہیں بیگانے، ملوکیت کے دیوانے
زبان و رنگ کی توڑی تھیں زنجیریں کبھی تم نے

وہی مشرق کے دیوانوں کو یہ آئے ہیں پہنانے
نہ ہونا شیفتہ نسل و وطن کے دیوتاؤں پر
اگر دورِ خلافت کے تمھیں از بر ہیں افسانے
نہ کرنا تم طوافِ پیکرِ جذباتِ حیوانی
وہی اک شمع ہے اسلام، تم جس کے ہو پروانے
نہیں جائز ہے فرقِ این و آں توحیدِ مطلق میں
ہوس کی گرد اُڑنے دو نہ راہِ دینِ برحق میں

بندِ سوم

کرو باطل پہ حملہ، حق کی تم شمشیر ہو جاؤ
مصافِ عدل میں فاروق رضؓ کی تصویر ہو جاؤ
فدا ہونا ہے تم کو کعبۂ دیں کی حمایت میں
اُٹھو! اور خوابِ ابراہیمؑ کی تعبیر ہو جاؤ
صدائے "فاستقم" کانوں میں ہے گر گونجتی اب تک
تو پھر اس آیتِ محکم کی تم تصویر ہو جاؤ
رہا کرتے تھے گردش میں جہاں ساغر شہادت کے

تم اب اُن میکدوں کے در پئے تعمیر ہو جاؤ

نہ ہونے پائیں ظلمِ ناروا کی ظلمتیں حائل

اگر تم آفتابِ عدل کی تنویر ہو جاؤ

نمائش عظمتِ حق کی اگر فرض اب تمہارا ہے

تو پھر سر تا بپا تم نعرۂ تکبیر ہو جاؤ

خدا کا آخری پیغام کہنا ہے تمھیں عالم

تو پھر تم شرق سے تا غرب عالمگیر ہو جاؤ

خدا کو ایک مانا ہے تو پھر یکتا تمھیں تم ہو

دلوں میں ہے اگر ایماں، تو پھر اعلیٰ تمھیں تم ہو

بندِ چہارم

یہی ضو تھی کہ جب اقصائے مغرب میں ہوئی عُریاں

گری اسپین کی فوجوں پہ برقِ ہیبتِ یزداں

سبق بھولا ہوا طارق کا پھر یاد آ گیا اُن کو

لیا سامان چھین اُن کا، جو تھے فرعونِ بے ساماں

شتربانوں پہ چڑھ کر آئے تھے طیارہ باں، لیکن

دکھائے اُن کو وہ غمزے کہ ہوش اُڑ گئے ہوئے پرّاں
حریفوں کو دکھائے ریف سے شیروں نے وہ تیور
کہ تھے صیدِ زبوں کی طرح خاکِ ریف پر غلطاں
صدا "احسنت" کی دی موسیٰ و طارق کی روحوں نے
مراکش کے جفاکش ہو گئے ملّت پہ جب قرباں
عرب کے پہلے ناموں کی یہ نسلِ دلاور ہے
کہ ساحل پر بھی اب تک ہے لاکھوں جھیل کر طوفاں
تمدن اس سے ٹکرا کر ہوا پسپا ہے یورپ کا
وہ سدِّ آہنیں ہے اس دلاور نسل کا ایماں
رہے ثابت قدم اُن کے شجاعت کی رکابوں میں
کبھی لرزے نہ قلب اُن کے فلک کے انقلابوں میں

بندِ پنجم

یہی قوت تھی جس نے دل کو افغانوں کے گرمایا
جہاں گرتی تھی برق، اس جا تنورِ آتش کا گرمایا
پڑے تھے قافلے ملّتِ بیضا کے دُور ابتک

لٹیروں نے تھا غول راہ بن کر اُن کو بہکایا
نظر آتا نہ تھا نورِ اتحادِ اہلِ ملت کا
اندھیرا غفلتوں کا وادیٔ کابل پہ تھا چھایا
فنا ہونے کو تھی موجِ خطر سے ملتِ افغاں
یکایک رعبِ حق بن کر امان اللہ خاں آیا
اُٹھا انگڑائی لے کر جب وہ شیرِ بیشۂ غیرت
تو اُس کے نعرۂ ایماں نے دل غیروں کا دہلایا
دیا توڑ اُس نے زنجیرِ فریبِ اہلِ مغرب کو
عطا منشورِ آزادی کا افغانوں کو فرمایا
نکالا قوم کو اس خضر نے ظلماتِ غفلت سے
پھر ان کو چشمۂ آبِ بقا کے پاس پہنچایا
جواں اس قوم کے نکلیں گے اب آتش کے پرکالے
کہ غیرت کا سبق سیکھیں گے اُن سے ایشیا والے

بندِ ششم

یہی جذبہ تھا جس نے روح پھونکی آلِ عثمانیں

سفینہ رہ گیا تھا آکے باقی جس کا طوفاں میں
خدا نے ناخدا جس کو دیا تھا مصطفٰے کا سا

سفینہ غرق وہ کس طرح ہوتا بحرِ عماں میں
ہلالِ آلِ عثماں از سرِ نو اس طرح چمکا

کہ نور ایسا نظر آتا نہیں مہرِ درخشاں میں
ہلالی تیغ جب ترکوں کی چمکی صاعقہ بن کر

تو اس کے عکس سے لرزہ تھا جسمِ فوجِ یوناں میں
ہوئی ترکی تمام اُن کی، جو تھے یونان کے حامی

کمال ایسا دکھایا لشکرِ ترکی نے میداں میں
مسیحی جو سمجھتے تھے کہ ہیں بیمار عثمانی

چھپے سر خجلتِ تشخیص سے اُن کے گریباں میں
زمانہ دیکھ کر ترکوں کو حیرت سے یہ کہتا ہے

"نہنگ ایسے نہ دریا میں، نہ شیر ایسے نیستاں میں"
شجاعت کا دم آگے اُن کے دشمن بھر نہیں سکتے

جو یوں مرنے پہ ہوں راضی وہ ہرگز مر نہیں سکتے

بندِ ہفتم

یہ جوہر ہو اگر شاخوں میں، وہ تیغِ رواں بن جائیں
یہ جرأت بکریوں میں ہو، تو وہ شیر ژیاں بنجائیں
یہ دارو ناتوانوں کو اگر دو، ہوں توانا وہ
پئیں بوڑھے اگر اس آتشیں مے کو جواں بن جائیں
یہ طاقت عورتوں میں ہو، تو مرد اُن سے نہ سر بر ہوں
غلاموں میں ہو یہ جذبہ، تو پھر وہ حکمراں بن جائیں
روانی یہ طبیعت میں ہو جن کی، سیل ہو جائیں
حرارت یہ ہو جن کے خون میں برقِ تپاں بن جائیں
یہ قوت جن کے دل میں ہو، نہ ہوں شاہوں سے وہ کمتر
یہ دولت پاس جن کے ہو، وہ گنجِ شائگاں بن جائیں
غرض یہ ہے کہ جن کے دل ہوں روشن نورِ ایماں سے
عجب کیا ہے کہ وہ فطرت کے گہرے رازداں بن جائیں
نچائیں وہ اگر چاہیں جہاں کو اک اشارے میں
قویٰ فطرت کے اُن کے ہاتھ میں کٹ پتلیاں بن جائیں

یقیں جانو کہ ان ہاتھوں میں ہے زورِ یدِ اللّٰہی
انھیں کی انگلیوں میں ہے کلیدِ مخزنِ شاہی

بندِ ہشتم

مسلمانو! اگر ملت کے ہو تم جاں نثاروں میں
تو پسپا کس لئے ہو زندگی کے کارزاروں میں
تمھارے دل میں بھر دی ہے خدا نے روشنی ایسی
کہ چرچا اُس کا رہتا ہے شب و روزاں ستاروں میں
رگوں میں ہے تمھاری دوڑتا جو خون غیرت کا
یہ شرخت اور یہ بے تابی نہیں دیکھی شراروں میں
دکھاؤ معرکہ میں زندگی کے دوڑ دھوپ ایسی
کہ ہو ممتاز، نام آور جہاں کے شہسواروں میں
سمندر میں کبھی گھوڑے ڈال کر جو بڑھنے والے تھے
تمھارا ہے شمار اُن فاتحوں کی یادگاروں میں
نہیں ممکن پتہ اُس کو ملے تم جیسے شیروں کا
کرے گر جستجو ہندوستاں اپنی کچھاروں میں

تمھارے دل کی بھٹی میں ہیں شعلے عزم صادق کے
لگا دو آگ ظلم و جبر کے خاشاک زاروں میں

تغافل تا بکے یاراں؟ زریب و رنگ باز آئید
نشانِ فتح بر سر از فضائے جنگ باز آئید

(رسالہ علی گڈھ میگزین جلد۔ ۲۔ نمبر۔ ۵ تا ۷۔ بابت
مئی تا جولائی ۱۹۲۳ء صفحہ۔ ۱ تا ۔ ۵ ۔)

ہندوستان کی سرگزشت پہاڑوں کی زبان سے

(۱)

ہیں ہند میں پھیلی جو پہاڑوں کی قطاریں — دامن میں پڑی لوٹتی ہیں جن کے بہاریں
ہیں چوٹیوں پر جن کے جمے برف کے انبار — سرگوشیاں کرتے ہیں ستاروں سے جو ہر بار
خاموش ہیں اور لب پہ نہیں اُن کے ترانے — تاریخِ کہن کے مگر ازبر ہیں فسانے
کانوں سے تصور کے سنو اُن کی صدائیں — کہتے ہیں ہمیں یاد ہیں دنیا کی ادائیں
اُلٹے ہیں ورق گردشِ ایام نے کیا کیا — دکھلائے ہیں منظر سحر و شام نے کیا کیا
صدیوں کے چھپے راز ہیں سینوں میں ہمارے — پوشیدہ جواہر ہیں خزینوں میں ہمارے

(۲)

اک دور وہ تھا جبکہ ہم اُبھرے تھے زمیں سے — خاتم پہ سمندر کی نمایاں تھے نگیں سے
تا بندِ کمر تھا ابھی موجوں کا تلاطم — تھا خوف کہ ہو جائیں نہ طوفان میں پھر گم
آتا تھا سمندر کبھی گرجوشِ غضب میں — ہنگامہ قیامت کا تھا اِس شور و شغب میں
صدیوں رہی یہ کشمکش اور زحمتِ پیہم — آخر کو سمندر کا ہوا غلغلہ مدّھم
موجیں رہیں کچھ لوٹتی دامن میں ہمارے — چپ چاپ تھے اور دیکھتے تھے ہم یہ نظارے

رگڑوں میں چٹانوں کو بہا لے گیا پانی،   کرتا رہا بنیادیں بھی ریشہ دوانی
گھس پس کے بدن چور تھے، لیکن نہ ہٹے ہم   ہر صدمۂ طوفاں کے مقابل تھے ڈٹے ہم
انجام ہوا یہ کہ ہٹا دور سمندر   پستی میں لگا بیٹھنے مغرور سمندر
تن تن کے اُبھرنے لگے ہم سطح زمیں تک   ہنس ہنس کے نظر ڈالتے تھے چرخ بریں پہ

(۳)

پھر دَور وہ آیا، کہ ہرے ہو گئے دامن   تھا قابلِ دید اُن پہ نباتات کا جوبن
روئیدگیوں کو کئے قدرت نے اِشارے   شاخیں سی لگیں پھوٹنے ریشوں کے سہارے
اُس جوش نے گلکاریاں کیا کیا نہ دکھائیں   جو خشک چٹانیں تھیں، وہ گلشن نظر آئیں
جو چوٹیاں رہتی تھیں سدا برف سے مستور   بیشک وہ نباتات کے حملے سے رہیں دُور
گرمی سے اگر برف پگھلتی تھی ہماری   ہوتے تھے ہر اک سمت میں دریا کئی جاری
کیا زمزمے کرتے ہوئے دریا تھے اترتے   طاسوں کی زمینوں کو وہ شاداب تھے کرتے
جن پست زمینوں میں بھرے رہتے تھے جل تھل   اب اُن میں جو دیکھا، تو کھڑے ہو گئے جنگل

(۴)

پھر تیسرا دورہ ہوا اک بار نمودار   کچھ زندہ نباتات میں پیدا ہوئی رفتار
پانی میں پڑی تیرتی پھرتی تھیں جو گھانسیں   دیکھا تو وہ جاندار ہیں، اور لیتی ہیں سانسیں

وہ مچھلیوں کے بھیس میں آخر کو در آئیں — کثرت ہوئی اتنی کہ نہ پانی میں سمائیں
خشکی پہ جو پہنچیں تو پھدکنے لگیں ہر بار — مینڈک کی نئی نسل ہوئی اُن سے نمودار
خشکی و تری میں یونہی تبدیلیاں ہو کر — جانداروں کی نسلوں کے لگے پھیلنے لشکر
قدرت نے عجب رنگ کے بہروپ دکھائے — ہر روز نئے زندہ تماشے نظر آئے
خاموش تھے جو پہلے نباتات کے جنگل — اب زندگی اُن میں بھی لگی ڈالنے ہل چل

(۵)

پردہ پہ یونہی پردہ اُلٹتا رہا دوراں — جانداروں کی نسلوں میں ہوئی جنگ نمایاں
کمزور جو نسلیں تھیں، وہ غائب ہوئیں یکبار — تھی جن میں کہ طاقت، وہ ہوئیں اور بھی جاندار
جو نسل کہ ممتاز ہوئی تاب و تواں میں — زندہ وُہی باقی رہی اطرافِ جہاں میں
کمزوروں کو قدرت یہ سُناتی رہی پیغام — زندہ نہ بچائیگی انھیں گردشِ ایام
بے تاب و تواں رہنا ہی پیغامِ فنا ہے — مغلوب ہو جو جنگ میں، غالب کی غذا ہے
آفاق میں ہم شور یہ سُنتے تھے کہ ناگاہ — قدرت نے کیا ایک نئی نسل سے آگاہ
کہتے تھے کہ اس نسل میں آدم کے ہیں فرزند — جانداروں کی نسلوں میں وہ ہیں سب سے تنومند
جنگل کے درندوں سے وہ ڈرتے نہیں زنہار — خون اُن کا بہاتے ہیں، جو کرتے ہیں وہ پیکار
غاروں میں وہ چھپتے ہیں، درختوں پہ ہیں بستے — چھیڑے نہ اُنھیں کوئی، تو وہ کچھ نہیں کہتے

غاروں میں ہمارے بھی تھے کچھ ایسے ہی زندے
جن سے کہ لرزتے تھے سدا بن کے درندے

بالوں میں ڈھکے رہتے تھے جسم اُن کے تمام
تھے دوڑتے جنگل میں وہ جس طرح دد و دام

پنجوں میں جو ناخن تھے، وہ تلوار تھے گویا
لڑنے کے لیے بس یہی ہتھیار تھے گویا

جب باندھ کے وہ ٹولیاں جنگل میں در آتے
کرتے تھے شکار اور انھیں کچا ہی چباتے

خونخواروں کے پائے تھے جو اوصاف انھوں نے
جنگل کو درندوں سے کیا صاف انھوں نے

آزاد وہ پھرتے تھے ہر اک دشت و جبل میں
دم مار نہ سکتا تھا کوئی اُن کے عمل میں

(۶)

ہم دیکھتے چپ چاپ تھے قدرت کے یہ نیرنگ
لائی مگر اب گردشِ ایام نیا رنگ

مشرق سے اسی شکل کے آئے نئے خونخوار
گھاٹی سے ہماری ہوئے داخل وہ ستمگار

قد اُن کے تھے کوتاہ، مگر زرد بدن تھے
حملے میں وہ چیتے، تو لپکنے میں ہرن تھے

کالوں پہ وہ اسطرح گرے کرکے تگ و تاز
جسطرح پرندوں پہ گریں ٹوٹ کے شہباز

کالوں کے پرے ہٹ گئے اِن زرد تنوں سے
بن آئی نہ جب بات، تو بھاگے وہ بنوں سے

پیچھے سے کمک پر کمک آتی رہی پیہم
کالوں میں جو باقی تھا، رہا وہ بھی نہ دم خم

زرد آندھیاں مشرق سے اُٹھیں ایسی لگاتار
جو کالی گھٹاؤں کو اُڑا لے گئیں اک بار

اب زرد تنوں ہی کا یہاں سکہ رواں تھا
کالوں کا جو پرچم تھا، وہ ظلمت میں نہاں تھا

کالوں سے مگر زرد تنوں کا ہوا پھر میل — اس میل سے قدرت نے دکھایا عجب اک کھیل
اک نسل نئی اُن سے ہوئی اور نمودار — اُتر سے دکن تک جو ہوئی جا کے عملدار

(۷)

تھی ہند میں پھیلی یہ حکومت کہ قضا را — اک اور نیا قافلہ مغرب سے سدھارا
ہے گوشۂ مغرب میں درہ ایک کشادہ — داخل ہوئیں قومیں اسی رستے سے زیادہ
اس راہ سے تورانیوں کے دَل نکل آئے — آئے بھی تو اس طرح کہ جیسے اجل آئے
پہلے تو ہوئے سندھ کے صحرا میں وہ داخل — جلد اپنی حکومت میں اُسے کر لیا شامل
پھر وادیٔ گنگا میں قدم اپنے جمائے — دشمن کے پرے جنگ کے میداں سے ہٹائے
چمکاتے ہوئے بجلیاں تلواروں کی رن میں — آخر کو وہ جا پہنچے حدِ ملکِ دکن میں
پہنچا عَلَمِ فتح سرِ چرخِ کہن تک — قابض ہوئے اس مُلک پہ اُتر سے دکن تک
اقبال نے تورانیوں سے قول تھا ہارا — عظمت کی بلندی پہ چمکتا تھا ستارا
دُنیا نے نہ دیکھے تھے کبھی صف شکن ایسے — میداں میں نہ چمکے کبھی شمشیر زن ایسے
تھے گلخنِ جذبات کے گویا وہ شرارے — شان اُن کی، جلال اُن کا نہ بھولینگے ستارے
حیرت سے تھے اس قوم کو ہم دیکھ کے خاموش — اب تک بھی فسانہ نہ ہوا اُن کا فراموش

(۸)

تورانیوں کی راہ سے اک قوم پھر آئی / اس قوم نے کی سندھ کے ساحل پہ چڑھائی

دریا تھا یہ قہّار، مگر ہوگیا پایاب / آگے نظر آتی تھی انھیں کشورِ پنجاب

وہ کشورِ پنجاب کہ سرسبز چمن تھی / حسن اور لطافت میں وہ جنت کی بہن تھی

چمکا علمِ آریہ اس ملک پہ ناگاہ / پامال لگی ہونے حسینوں کی طرب گاہ

تورانیوں کی فوج سے ہوتی رہیں جنگیں / سینوں میں تڑپتی تھیں شجاعت کی امنگیں

ٹکرائیں جو دو طاقتیں اس ملک میں باہم / جنت ہوئی جھنکاریوں سے اُن کی جہنم

تورانیوں کی فوج میں ہلچل ہوئی آخر / جو صف کہ دمِ جنگ تھی اوّل، ہوئی آخر

باقی نہ رہا موجۂ دریا میں تلاطم / اک بلبلہ ٹکرا کے کنارے سے ہوا گم

مشرق کی طرف بڑھنے لگیں آریہ فوجیں / تا وادیِ گنگا سے گزر جائیں یہ موجیں

گنگا کے کنارے پہ علم تھم گئے آخر / مشرق کی فضاؤں میں قدم جم گئے آخر

جب رام کی عظمت کا ہوا دور نمایاں / تیار ہوا فتحِ دکن کے لئے ساماں

تورانیوں نے آخری توقیر بھی کھو دی / سونے کی جو لنکا تھی سمندر میں ڈبو دی

قسمت سے پہاڑوں کو میسر جو زباں ہو / ممکن ہے کہ اُس قوم کی طاقت کا بیاں ہو

وہ قوم، زباں جس کی ہے وسعت میں سمندر / جو علم کے دریا ہے چھپائے ہوئے اندر

وہ قوم، کیا فلسفہ کو جس نے مزین — جس کا ادب افکارِ لطیفہ کا ہے گلشن

وہ قوم، جو اقبال کے مطلع کی ضیا تھی — جو زندگی و موت کی اسرار کشا تھی

میدانِ کرکشتر میں اُلٹا ورق اُس کا — دُنیا کو مگر یاد ہے اب تک سبق اُس کا

(۹)

دِن ڈھل گیا جب آریوں کے علم و عمل کا — اِک پرتو نو یاں کے در و بام پہ جھلکا

بیدار ہوئی قسمت خوابیدہ عرب کی — لیں کروٹیں اُس قوم کی ہمت نے غضب کی

بیڑا ہوا اک سندھ کے ساحل پہ نمودار — ہیبت سے لرزنے لگے ناگہ در و دیوار

توحید کی آنے لگیں پُرجوش صدائیں — چلنے لگیں آثارِ قیامت کی ہوائیں

تاریکیاں چھپنے لگیں اُس نور کے آگے — سر جھکنے لگے رایتِ منصور کے آگے

لہرانے لگا سندھ کی وادی میں وہ پرچم — ظلمت کدہ میں جس سے ہوا نور کا عالم

پھر غزنوی اقبال کا چمکا رُخِ پُر نور — گجرات تک اس نور سے ظلمت ہوئی کافور

پھر غوریوں نے رایتِ اقبال بڑھایا — پنجاب میں سیلابِ فتوحات بہایا

پھر خلجی و تغلق نے دکن پر کیے دھاوے — تقدیر کے توسن کو وہ دیتے رہے کاوے

پھر لودھی و سوری نے چمک اپنی دکھائی — مغلوں کے جو انوارِ تجمل میں سمائی

مغلوں کا وہ اقبال، وہ شوکت، وہ تجمل — جس کا کہ پڑا گنبدِ افلاک میں تھا غل

اب تک یہ فسانے ہیں مورخ کی زباں پر — ابہام کا پردہ نہیں اس صاف بیاں پر
یہ عہد وہ تھا جس میں تمدن تھا منور — آئینۂ انصاف نہ ہوتا تھا مکدر
اٹھتی تھیں ہر اک دل میں ترقی کی امنگیں — آزادیوں کی دوڑتی رہتی تھیں ترنگیں
ہر سمت تجارت کی کھلی رہتی تھیں راہیں — صنعت کے کمالات پہ پڑتی تھیں نگاہیں
در علم و فضیلت کے کھلے سب کے لئے تھے — سب بادۂ انصاف و مساوات پئے تھے
غفلت کا نشاں چھا گیا اس قوم پہ جس دم — دفتر ہوا اقبال کا سب درہم و برہم
ہر سمت سے اٹھنے لگیں آفت کی گھٹائیں — ہر گوشہ سے چلنے لگیں نکبت کی ہوائیں
بازار زد و کشت ہوا گرم ہر اک جا — فتنہ حسد و بغض کا ہونے لگا برپا

(۱۰)

اک اور نئی قوم ہوئی ملک میں داخل — جو فرض حکومت سے نہیں رہتی ہے غافل
اس قوم کے افراد میں ہیں الفتیں ایسی — زنجیر کی کڑیوں میں ہو وابستگی جیسی
ہر فرد کی سرگرمیاں ملت کے لئے ہیں — حکمت کے جو گر ہیں، وہ حکومت کیلئے ہیں
نقشے جو پرانے تھے وہ سب ہو گئے معدوم — ہندو و مسلماں ہیں اب اس قوم کے محکوم
ہیں پردۂ عبرت کے یہ ناساز ترانے — ہیں ہند کی تاریخ کے یہ چند فسانے
جس قوم میں باقی نہیں الفت کی لگن ہو — وہ کشتۂ ظلم و ستم چرخ کہن ہے

راحت میں ہے جو قوم، اُسے راحت ملیگی
جو قوم ہے غافل، اُسے مہلت نہ ملیگی

قوت سے نہ غافل ہو کہ قوت ہی میں حق ہے
اُستادِ ازل نے یہ دیا سب کو سبق ہے

سُن لو کہ یہ ہے گردشِ ایام کا پیغام
آرام سے بیٹھو گے تو پاؤ گے نہ آرام

"حرکت میں ہے برکت" یہ زمانے کی صدا ہے
آغاز میں سستی ہو تو انجام فنا ہے

("اودھ اخبار" لکھنؤ۔ ۲۴۔ اپریل سنہ ۱۹۲۵ء)

شرابی کی بکواس

(شرابیوں کے اُلجھے ہوئے خیالات کا دلچسپ خاکہ ایک شرابی کی زبانی)

بالائے فلک میں ہوں کہ ہوں زیرِ زمیں میں
کیا پی کے شراب آج بہکتا تو نہیں میں

کیا مجھکو بھگائے لئے جاتی ہیں ہوائیں
کیا تودۂ خاشاک ہوں بالائے زمیں میں

کیا پی کے شراب آج بہکتا تو نہیں میں

بگٹٹ یہ اُڑائے لئے جاتا ہے مجھے کون
گھوڑے پہ بھی کسنے نہیں پایا ابھی زیں میں

کیا پی کے شراب آج بہکتا تو نہیں میں

قارون سے کم مرتبہ شاید نہیں میرا
جاتا ہوں چلا خود بخود اب زیرِ زمیں میں

کیا پی کے شراب آج بہکتا تو نہیں میں

گردن میں مری طوق نہ پہناؤ حریفو!
کیا تم کو یقیں ہے کہ ہوں شیطانِ لعیں میں

کیا پی کے شراب آج بہکتا تو نہیں میں

کھُلتا نہیں کچھ مجھ پہ گدا ہوں کہ شہنشاہ
ہوں تخت نشیں اور کبھی خاک نشیں میں

کیا پی کے شراب آج بہکتا تو نہیں میں

سکہ مرا چلتا ہے سدا روئے زمیں پر
لاتا ہوں ابھی چرخ کو بھی زیرِ نگیں میں

جب یوں مرے اوپر کو گزر جائیں جہازات　　کیوں مثل سمندر کے نہ ہوں چین جبیں میں

کیا پی کے شراب آج بہکتا تو نہیں ہیں

شاہانِ جہاں اُن پہ سدا لڑتے رہیں گے　　چھوڑوں گا خزانے جو دم بازپسیں میں

کیا پی کے شراب آج بہکتا تو نہیں ہیں

دم بھر میں یہ سب توڑ کے لے آؤں گا تارے　　اُڑ کر ابھی جاتا ہوں سوئے عرشِ بریں میں

کیا پی کے شراب آج بہکتا تو نہیں ہیں

دیکھو مجھے اے دوستو تم رند نہ کہنا　　تہ کر کے نہ رکھ دوں جو یہ سب فرشِ زمیں میں

کیا پی کے شراب آج بہکتا تو نہیں ہیں

آدھا تو فلک پر ہوں میں، آدھا ہوں زمیں پہ　　ہے یہ ہی مکاں جس میں کہ رہتا ہوں مکیں میں

کیا پی کے شراب آج بہکتا تو نہیں ہیں

جن مجھ سے بڑے ہیں نہ ملک مجھ سے بڑے ہیں　　بس اپنی بڑائی ہی پہ رکھتا ہوں یقیں میں

کیا پی کے شراب آج بہکتا تو نہیں ہیں

ڈر مجھ کو تفنگوں کی تفنگوں سے نہیں ہے　　آجاؤں نشانے پہ تو ہٹتا ہوں کہیں میں

کیا پی کے شراب آج بہکتا تو نہیں ہیں

اک روز دکھا دوں گا تمھیں اپنے تماشے　　تم بھی یہیں دُنیا میں ہو موجود یہیں میں

کیا پی کے شراب آج بہکتا تو نہیں میں

پیچھے نہ رہوں گا کبھی میں تم سے رقیبو! تم اُڑ کے جہاں جاؤ گے پہنچوں گا وہیں میں

کیا پی کے شراب آج بہکتا تو نہیں میں

("اودھ اخبار" ۶۔ اپریل ۱۹۲۳ء)

دردِ سلیم

(اپنے دوست مولوی سید عبدالودود صاحب درد بریلوی کی پُر درد نظموں سے متأثر ہو کر)

میں درد کا مونس ہوں، مرا محرمِ تہ داں درد
رکھتا ہے سدا نام مرا وردِ زباں درد

کہتے ہیں جسے زندگیٔ عشق کی ہل چل
برپا ہے ترے دم سے یہ اے جانِ جہاں درد

آنکھوں کے تلے ناچنے لگتے ہیں شرارے
چٹکی میں پکڑتا ہے جو میری رگِ جاں درد

مشتِ خسِ تن کے لئے طوفاں ہے مرا اشک
ہے ہوش کے خرمن کے لئے برقِ تپاں درد

ہے روئے جواں فصلِ جوانی میں گلِ وَرد
اس وَرد کو دیتا ہے مگر رنگِ خزاں درد

گر بیخودیٔ عشق میں جاتا ہوں اُسے بھول
اُٹھ اُٹھ کے بتاتا ہے مرے دل کا نشاں درد

کرتا ہے مرا شکوہ تو بیدرد ہے ناصح
غافل ہے کہ رکھتا ہے مجھے گرمِ فغاں درد

بیتابیٔ دل نشہ کی جا ہے مجھے درکار
دے گھول کے ساغر میں مجھے پیرِ مغاں درد

پروانہ کی مانند خریدار ہیں گرتے
بازارِ وفا میں جو لگاتا ہے دُکاں درد

کیا ضبط کے انداز سکھاتا ہے مجھے عشق
ہونٹوں پہ عیاں خندہ ہے، پہلو میں نہاں درد

ہے اُس کے سبب نزع کا عالم شبِ غم میں
تا صبح نہ دے گا مجھے شاید کہ اماں درد

نقشہ ہے محبت میں یہ بیتابیِ دل کا — پارے کے تڑپنے کا دکھاتا ہے سماں درد

ہے ظلم کہ پہلو میں جگہ دوں نہ اُسے میں — ہمدرد جب اپنا مجھے کرتا ہے گماں درد

تیور پہ مرے دل کے نہ آئے گی شکن بھی — کیا تولتا ہے ہاتھ میں لے لے کے سناں درد

بگٹٹ ہی چلا جاؤں گا میں راہِ وفا میں — لے صبر کے ہاتھوں سے چھڑا اگرچہ عناں درد

تھم تھم کے جو اُٹھتا ہے مرے دل میں پئے عشق — سمجھا مجھے شاید کہ بے تاب و تواں درد

جذباتِ محبت مرے بھرتے ہیں طرارے — ہے عالمِ پیری میں بھی گویا کہ جواں درد

جیتا ہوں تو بس درد ہی ہمدرد ہے میرا — مر جاؤں گا تو ہوگا مرا مرثیہ خواں درد

ٹھہروں تو مجھے سایہ میں لیتی ہے مری آہ — نکلوں تو جلو میں مرے ہوتا ہے دواں درد

بیتابیاں بھر دیں مرے اندر ترے غم نے — بجلی سی ہے رکھتا مری رگ رگ میں رواں درد

ہمراز نہیں کوئی کروں کس پہ عیاں راز — ہمدرد نہیں کوئی کروں کس سے بیاں درد

رک جائے فلک چلنے سے لرزہ ہو زمیں کو — گر پردہ اُلٹ کر کبھی ہو جائے عیاں درد

نعمت کا یہ خوان اہلِ وفا پر ہے اُترتا — اے اہلِ ہوس آپ کی قسمت میں کہاں درد

شاید کہ محبت نے تری آگ لگا دی — اُٹھتا ہے مرے دل میں جو بن بن کے دھواں درد

برچھی سی مرے دل میں چبھو دی ہے یہ کس نے
رہ رہ کے سلیمؔ آج جو اُٹھتا ہے یہاں درد

("اودھ اخبار" ۶ جنوری ۱۹۲۴ء)

میں کیا ہوں ؟

ترے کوچے کی لطافت کا ثنا خواں ہوں میں
باغِ فردوس کا اک مرغِ خوش الحاں ہوں میں

بے حجابانہ جھلک تو نے دکھائی جب سے
آتشِ عشق کا اک شعلۂ عُریاں ہوں میں

چھیڑتی ہے مجھے قدرت کی فضا رہ رہ کر
کیا کوئی زمزمۂ مُرغِ خوش الحاں ہوں میں

لن ترانی مرے شعلوں کی زباں پر ہے مُدام
کس کے اسرارِ تجلّی کا زباں داں ہوں میں

چشمِ ظاہر کو مرے جلوۂ باطن کا ہے شوق
کیا کسی نامۂ سربستہ کا عنواں ہوں میں

قافلے مصر کے شاید مجھے کرتے ہوں تلاش
بند ہوں چاہ میں اور یوسفِ کنعاں ہوں میں

ہیں تمنائیں مری خون میں غلطاں ساری
دیکھو عبرت سے کہ اک گنجِ شہیداں ہوں میں

ہے عروسِ سخن آراستہ جلووں سے تمام
کیوں کسی حُسن کا شرمندۂ احساں ہوں میں

میرے جذبات پھر انگڑائیاں لے کر اُٹھے
کیوں نہ تیری نگہِ ناز پہ نازاں ہوں میں

کون ضامن ہے ہوا کا کہ نہ چھیڑے گی مجھے
رہ کے فانوس میں بھی شعلۂ لرزاں ہوں میں

نظر آیا نہ سکندر کو کنارا جس کا
کہہ دو لے خضر وہی چشمۂ حیواں ہوں میں

ہاتھ لپکاتے ہیں عشاقِ سخن جس کی طرف
شاہدِ فکر کا وہ گوشۂ داماں ہوں میں

چاک سے میرے نکلتے ہیں ہزاروں خورشید
صبح رخشندۂ فطرت کا گریباں ہوں میں

ہے مصیبت مری آرائشِ دُنیا کا سبب
چہرۂ دہر پہ اک زلفِ پریشاں ہوں میں

رقص کرنا تری موجوں نے ہی سیکھا جس سے
اے امنگوں کے سمندر وہی طوفاں ہوں میں

ڈھونڈتی حسن کے سورج کی کرن ہے جس کو
شبنمِ عشق کا وہ قطرۂ غلطاں ہوں میں

میں ابھی اپنی حقیقت سے ہوں غافل ورنہ
جو ہے مسجودِ فرشتوں کا وہ انساں ہوں میں

مجھ کو سورج کی شعاعوں نے رنگا ہے برسوں
دامنِ کوہ میں اک لعلِ بدخشاں ہوں میں

رکھتے ہیں آنکھ کی پتلی کی طرح مجھ کو عزیز
مگر احباب کی آنکھوں سے بھی پنہاں ہوں میں

بچ کے چل مجھ سے ذرا موجِ نسیمِ سحری
بزمِ قدرت کے لئے شمعِ شبستاں ہوں میں

طور کو جس نے کیا ایک جھلک میں سُرمہ
پھر اُسی حسنِ جہاں سوز کا جویاں ہوں میں

خوان جلوؤں کے بچھائے گئے جس کے آگے
محفلِ حسنِ ازل کا وہی مہماں ہوں میں

کہہ دو تاروں سے کہ آنکھیں نہ ملائیں مجھ سے
وادیٔ عشق کا اک ذرۂ تاباں ہوں میں

مجھ کو افسردہ نہ دیکھیں گے کبھی اہلِ جہاں
بزمِ تصویر کا گلدستۂ خنداں ہوں میں

آگ لگتی نہیں کیوں خرمنِ ہستی میں مرے
غمزہ کہتا ہے ترا، برقِ درخشاں ہوں میں

جزوِ اعظم مرے افسانے کا ہے عشق کا باب
غور سے دیکھ۔ کہ سعدی کی گلستاں ہوں میں

جلوے کیا کیا مری آنکھوں سے گزر جاتے ہیں
بزمِ فطرت میں اک آئینۂ حیراں ہوں میں

ٹپکی پڑتی ہے تجلی مرے شعلوں سے سلیم
مسکراتے ہوئے تاروں کا زباں داں ہوں میں

(ادبی دنیا اگست ۱۹۲۹ء جلد ۱ - نمبر ۴ - صفحہ ۱۳۳)

مجاز سے حقیقت تک

(۱)

چہرے سے نقاب اپنے ہٹا دے مرے گلفام
پھر دیکھ کہ کس طرح چمکتا ہے لبِ بام
مہتاب سے جاتی ہے بدل تیرگیِ شام
آتے ہیں قدم چومنے کو چرخ سے اجرام
بجلی سی ابھی کوندنے لگتی ہے فضا میں
اک نور کا دریا نظر آتا ہے ہوا میں

(۲)

کر چشمِ فسوں ساز کو آمادہ ادا پر
پھر دیکھ کہ پریاں تری ہوتی ہیں مسخر
سجدے میں ترے سامنے گرتے ہیں فسوں گر
کھلتے ہیں اشاروں میں ترے حسن کے دفتر

شہرت تری پھیلے ابھی جادو نظروں میں
ہو جائے قیامت سی بپا عشوہ گروں میں

(۳)

رکھ سامنے آئینہ ذرا اے بتِ خوش رنگ
پھر دیکھ کہ ہوتا ہے وہ جلوے سے ترے دنگ
ہو جائے مقابل جو ترے حسن کا نیرنگ
تاروں کی تجلّی بھی ٹھہرتی نہیں پاسنگ
چشمہ تری شوخی کا اگر یار اُبل جائے
آغوش سے آئینے کے سیماب نکل آئے

(۴)

جنبش میں تُولا، اپنے قدِ جلوہ فگن کو
پھر دیکھ، کہ آتی ہے حیا سروِ چمن کو
بُھولے گا ابھی کبکِ دری اپنے چلن کو
یاد آئے گی یہ چال نہ آہوئے ختن کو
شوخی ہے تری چال میں، مستی بھی، ادا بھی

ہر نقش قدم پر ترے جھکتی ہے ہوا بھی

(۵)

ہستی ہے تری حُسن کا بے تھاہ سمندر
ہر ذرہ ترے جسم کا ہے چشمۂ خاور
رگ رگ میں تری رہتی ہے اک برق سی مضطر
رکھے گا نہاں پردہ میں کب تک رُخ انور
گیتی پہ نظر ڈال ذرا ناز و ادا سے
آتی اَرِنی کی ہے صدا ارض و سما سے

(۶)

اے حسن جہاں سوز دکھا جلوۂ عُریاں
تارے بھی ترے شوق کے رستے میں ہیں رقصاں
ہے نُورِ سحر دُھن میں ترے چاک گریباں
ہے بادِ صبا بھی تری منزل میں شتاباں
گُل کھول کے آنکھیں تری آمد کو ہیں تکتے،
مرغانِ چمن یاد میں تیری ہیں چہکتے

(۷)

ملبوسِ مجازی میں تو اب تک ہے ضیا پاش
لازم ہے کہ اب حسنِ حقیقت کو کرے فاش
دیکھیں تجھے بے پردہ ہم اے حُسنِ ازل کاش
باقی نہ رہے صورت و معنی میں یہ پرخاش
دھوکا جو نظر کا ہے، وہ اُٹھ جائے نظر سے
قطرہ کا کھُلا رشتہ ہو، تابندہ گہُر سے

(۸)

میں قطرۂ شبنم ہوں، تو خورشید درخشاں
یہ قطرہ ترے نُور کے چشمے میں ہو پنہاں
میں دستۂ خاشاک ہوں، تو شعلۂ عُریاں
کر صورتِ گلدستہ تو اس دستہ کو خنداں
گُل ہو کے مری شمع رُخِ صُبح دکھا جائے
ہستی مری مٹ کر تری ہستی میں سما جائے

("روحِ نظم" حصہ اول صفحہ ۹۸-۹۹)

حُسن کی زبان سے

(۱)

جہاں میں ہے ضیا مری، میں حُسن جلوہ کار ہوں
میں رونق اس چمن کی ہوں، میں فصلِ نو بہار ہوں
میں زیبِ کائنات ہوں، میں فخرِ روزگار ہوں
میں شاہدِ نہفتہ کا جمالِ آشکار ہوں
کہ آئینہ میں دہر کے، میں عکسِ کردگار ہوں

(۲)

کلیم کو نہ اپنا رُخ، میں بے خطر دِکھا سکا
سُراغ میرے نور کا نہ کوہِ طور پا سکا
نہ میں نظر میں آسکا، نہ عقل میں سما سکا
خیال میرے اوج پر، نہ پَر لگا کے جا سکا

میں حصنِ بے شکست ہوں، میں راہ ناگزار ہوں

(۳)

پڑی ہے اک خفیف سی نجوم پر کرن مری
کہ رکھتی ہے طواف میں سدا انھیں لگن مری
چھپی حجابِ قدس میں ہے شمعِ انجمن مری
ستارے جل کے خاک ہوں جو دیکھ لیں پھبن مری
میں گنجِ آب و تاب ہوں، میں بحرِ نور و نار ہوں

(۴)

یہ چاندنی کی ٹھنڈکیں، یہ دھوپ کی حرارتیں
یہ صبح کی صباحتیں، یہ شام کی ملاحتیں
زمین کی یہ زینتیں، فلک کی یہ لطافتیں
یہ بجلیوں کی شوخیاں، یہ بادلوں کی رنگتیں
یہ رنگ و روپ ہیں مرے، میں ان میں آشکار ہوں

(۵)

ہر ایک شاخسارِ زیں، مجھی سے آب و رنگ ہے

پھپکتے ہیں درخت جو، یہ میری ہی اُمنگ ہے
پُھدکتے ہیں پرند سب، مُجھی سے یہ ترنگ ہے
کرشمے دیکھ کر مرے، ہر ایک عقل دنگ ہے
ہیں کھیل نت نئے مرے، میں وہ طلسم کار ہوں

(۶)

گلوں کے رنگ رنگ سے عیاں ہیں جھلکیاں مری
چمن کے غنچہ غنچہ میں شمیم ہے نہاں مری
زباں پہ پتے پتے کی رواں ہے داستاں مری
شِرنگ پود پود کی جڑوں میں ہے دواں مری
میں رُوح سبزہ زار ہوں، میں نازشِ بہار ہوں

("تصویرِ جذبات" جلد دوم) صد ۶۴

خمارِ تخیّل

ستارے تم سے نہ کر سکیں گے، برابری حسن کی چمن میں
ہزاروں شمس و قمر نہاں ہیں، تمھارے جلوہ کی اک کرن میں
ہے ایک ساقی کا فیض جاری، قدح کشو کچھ ہر انجمن میں
نشے ہیں یہ خود پرستیوں کے چھپی ہے جو شیخ و برہمن میں
کبھی جو تقریر کرتے ہو تم، تو پھول جھڑتے ہیں ہر سخن میں
بھرے ہیں گویا ہزار گلشن، تمھارے اک غنچہ دہن میں
نہ اب تک آئی نظر وہ صورت، جو تجھ سے ہم سنگ ہو حسین میں
بتوں پہ بُت گو ہیں بدلے جاتے، جہاں کے بتخانۂ کہن میں
ذرا جھکا سر کو اپنے غافل! تماشے دیکھ اپنے دل کے اندر
تری نگاہوں کے سامنے ہے، لڑائی یزدان واہرمن میں
نظر اٹھا کر کوئی کہاں تک نہ دیکھے قدرت کی جامہ زیبی
بدل بدل کر ہے رنگ لائی بہار پھولوں کے پیرہن میں

نظر تغافل سے کی جو تو نے اثر نہ پوچھ اسکا مجھ سے ظالم!
وہ ولولے تھے کبھی جو زندہ، ہیں مُنہ لپیٹے پڑے کفن میں

اگر ہو تم بوالہوس تو یار و غضب کے تیور سے اس کے بچنا
چھپی ہے شمشیر اصفہانی جبین قاتل کی ہر شکن میں

سدا بہار ایک پھول تجھ سا نہ اب تک اس گلستاں سے اٹھا
شگوفے کھل کھل کے جھڑ گئے ہیں ہزاروں ایجاد کے چمن میں

(رسالہ تجلی دہلی - جنوری ۱۹۲۷ء جلد ۲ نمبر ۱ صفحہ ۲۸)

غمزۂ حُسن

دکھا کے پھر غمزۂ میرے دل کو عطا کیا اضطراب تو نے
چلا کے پھر صرصرِ تمنا، اُلٹ دیا فرشِ خواب تو نے

کبھی جو پھولوں کی انجمن میں، اُلٹ دیا ہے نقاب تو نے
تو جامِ شبنم کو بھر دیا ہے، انڈیل کر آفتاب تو نے

اُٹھی ہیں فطرت کے دل میں کیا کیا ترے سبب سے بہار اُمنگیں
چمن کی افسردہ ٹہنیوں کو سُنگھائی بوئے شباب تو نے

فدا ہوا میں تیری شوخیوں پر، نہ کیونکر اے حُسنِ غمزہ پرور
کہ میری غفلت کے آشیاں پر گرائی برقِ عتاب تو نے

خوشی سے ہو ہو کے مست روحیں، لگیں تمنائے رقص کرنے
دلوں کے خلوتکدے میں آکر جو غم کا چھیڑا رباب تو نے

وہ گل جو تھے حُسن کے چمن میں، اُڑا لیے تو نے رنگ اُن کا
دیا ہے کھول اے نسیمِ غیرت، یہ کس کا بندِ نقاب تو نے

گلوں سے اے فصلِ گُل اُچٹ کر نگاہ گلچیں کی جھومتی ہے

عروسِ گلشن کی ہر ادا میں بھری ہے رنگیں شراب تو نے

ازل کے دن دستِ ناز میں سے جو تو نے چھیڑا یہ سازِ ہستی
کیا ہے چاک اپنی انگلیوں سے خموشیوں کا حجاب تو نے

نسیمِ صبحِ بہار بن کر، چمن میں اے جذبۂ محبت!
سنایا شبنم کو کس ادا سے فسانۂ آفتاب تو نے

یہاں وہ نازک مزاج ٹھیرے، تو کیونکر اے جذبۂ تمنا
کہ گوشہ گوشہ میں دل کے اندر بچھا دیا اضطراب تو نے

اگرچہ در پردہ تیرے غمزے دکھائیں چشمک فنا کی لیکن
ہزاروں جلوے ہیں زندگی کے، کئے ہیں جو بے حجاب تو نے

ترے تبسم کی شوخیوں کی یہ ایک تشنہ جھلک تھی ساقی
کہ قطرہ قطرہ کو خونِ دل کے پلا دیا اضطراب تو نے

کرے گی کیا ہمسری قیامت ترے قدِ فتنہ آفریں سے
کہ ٹھوکروں میں مسل دیئے ہیں ہزارہا انقلاب تو نے

کرن حقیقت کی تلملائی، کہ پھونک دے پردۂ نظر کو
غبارِ حسنِ مجاز کا جب اتار پھینکا نقاب تو نے

عروسِ معنی نے مجھکو دیکھا، ادا سے گردن اُٹھا اُٹھا کر
دیا ہے پیری میں نشے تخیل، مجھے وہ رنگین شباب تو نے

ہر ایک سطر نفس میں غافل، ہزاروں اسرار جلوہ گر ہیں
ورق ورق کھول کر نہ دیکھی، یہ زندگی کی کتاب تو نے

ستارے معنی کے آسماں کے زمیں پہ گر کر ہیں سجدہ کرتے
تسلیم کو اے ضمیرِ روشن، دکھایا یوسف کا خواب تو نے

(رسالہ "جاوید" دہلی)

نغمۂ حرّیت

مرے دل میں اُٹھتے ہیں ولولے، کہ ہُوں گلشن بادِ بہار میں
کبھی غنچے پر ہو مرا گذر، کبھی پھول سے ہوں دوچار میں
کبھی گلشنوں کو بتاؤں میں، وہ جو ضابطے ہیں سنگار کے
کبھی بلبلوں کو سکھاؤں میں، وہ جو زمزمے ہیں بہار کے
کبھی بادلوں کو اُڑاؤں میں، کبھی پانیوں کو نچاؤں میں
کبھی راگ عیش کے گاؤں میں، کبھی آپ جد میں آؤں میں
کبھی جاؤں دامن کوہ میں، کبھی وادیوں میں مگن پھروں
کبھی گشت دشت میں ہو مرا، کبھی سوئے صحن چمن پھروں
جو کسی علاج سے دب سکے، مجھے ایسا جوش جنوں نہ ہو
مرے ولولوں میں کمی نہ ہو، مری شوخیوں میں سکون نہ ہو
ہے خلاف طبع مرے لئے، کہ رہوں حجاب میں بند میں
کروں کیوں نہ نغمۂ حرّیت، سر رہ گذر پہ بلند میں

(اودھ اخبار ۲۰ مئی ۱۹۲۴ء)

حُسنِ فطرت

فطرت کا جو مطالعہ کرتے ہیں صبح و شام
دریائے حُسن سے وہ گذرتے ہیں صبح و شام

دم خالقِ جمال کا بھرتے ہیں صبح و شام
اس لُطفِ زندگی پہ وہ مرتے ہیں صبح و شام

دن ہو تو تاکتے ہیں گلوں کے ہجوم کو
شب ہو تو دیکھتے ہیں وہ بزمِ نجوم کو

قدرت کے جلوے ہیں جو نمایاں اِدھر اُدھر
پھرتے ہیں مست بادلِ حیراں اِدھر اُدھر

پاتے ہیں حُسن کو جو درخشاں اِدھر اُدھر
مِلتا ہے اُن کو عشق کا ساماں اِدھر اُدھر

شمعوں کے گردِ صورتِ پروانہ پھرتے ہیں
پھولوں پہ مثلِ بُلبلِ دیوانہ گرتے ہیں

پھیلی ہیں اُن کے گرد نظاروں کی جنتیں
گھیرے ہوئے ہیں اُن کو بہاروں کی زینتیں

آتی ہیں چارسُو نظر اُن کو لطافتیں
شیریں صباحتیں ہیں تو رنگیں ملاحتیں،

کڑیاں تلاشِ دید کی جب جھیلتے ہیں وہ
فردوسِ زندگی میں پڑے کھیلتے ہیں وہ

کہتا ہے حسن اُن سے کہ دیکھو چمن مرا ہر نخل تازہ میں ہے بھرا بانکپن مرا
بھرتے ہیں دم بہار میں سرو سمن مرا جلوہ ہر ایک رنگ میں ہے موجزن مرا

نیرنگ زندگی مرا ہر ایک رنگ ہے
فطرت بھی دیکھ کر مرے رنگوں کو دنگ ہے

سانچوں میں شوخیوں کے میں ڈھلتا ہوں دم بدم سج کر نیا لباس نکلتا ہوں دم بدم
تیور میں دلبری کے بدلتا ہوں دم بدم، بن کر چھلاوہ، دل کو میں چھلتا ہوں دم بدم

ہر ایک طرز جلوہ گری جانتا ہوں میں
حسنِ ازل کی رمز کو پہچانتا ہوں میں

نقالِ دلبری یہ ستارے ہیں سب مرے تاروں کی چشمکوں میں اشارے ہیں سب مرے
یہ دامنِ شفق میں شرارے ہیں سب مرے بجلی کی شوخیوں میں طرارے ہیں سب مرے

پھیلا ہے اِس فضا میں مرا نُور دور تک
تاروں کی بھی رسائی نہیں میرے نور تک

شاعر کے دل پہ جب مرا الہام اُترتا ہے سیلابِ نُور اُس کی رگوں سے گزرتا ہے
اک آفتاب مطلعِ دل سے اُبھرتا ہے نور اُس کا شاعری کے اُفق پر بکھرتا ہے

اُس کی زباں سے نُور کی دھاریں اُبلتی ہیں

خامہ سے نخلِ طور کی شاخیں نکلتی ہیں

چاہوں اگر تو دل میں مصور کے آؤں میں — تصویر کو بہشتِ تصور بناؤں میں
رنگوں کے وصل و فصل کی رمزیں بتاؤں میں — صنعت میں دھوپ چھاؤں کا نقشہ دکھاؤں میں

ہوتا ہے جب رواں مری رنگیں روش پہ وہ
کرتا ہے وجد اپنے قلم کی کشش پہ وہ

کرتا ہوں جب حلول مغنی کے ساز میں — بھرتا ہوں رنگ آگ کے سوز و گداز میں
ہے ربط حسن و عشق کے ناز و نیاز میں — نسبت وہ ہے سُروں کے نشیب و فراز میں

جب اہلِ راز ساز کی آواز سنتے ہیں
ہر سُر کے سر کو جان کے سر اپنا دھنتے ہیں

پرتو صنم تراش پہ پڑتا ہے گر مرا — ہوتا ہے اُس کی چشمِ تخیل میں گھر مرا
پاتا ہے اپنے بُت میں ہنر جلوہ گر مرا — آنکھوں سے دیکھتا ہے وہ روشن ہنر مرا

صانع کی آنکھ دیکھ کے صنعت جھپکتی ہے
اُس کے بتوں سے میری خدائی ٹپکتی ہے

ہر شہر کے حسینوں کی شہرت مجھی سے ہے — جنسِ لطیف کی یہ لطافت مجھی سے ہے
منظر تماشا گاہوں کا جنت مجھی سے ہے — جنت کے طالبوں کو بھی اُلفت مجھی سے ہے
دنیا و دیں سے کھیلتی ہیں شوخیاں مری — کونین کی زبان پہ ہے داستاں مری

(رسالہ "ہمایوں"، مئی ۱۹۲۸ء۔ جلد ۱۳ نمبر ۵ صفحہ ۳۸۹)

ے

خوں سے تر گر لبِ خنجر تجھے کرنے ہیں تو آ
تن یہ حاضر ہیں، جو بے سر تجھے کرنے ہیں تو آ

عالمِ قدس سے ہے تیرے لئے آرام کی جا
گر بپا دہر میں محشر تجھے کرنے ہیں تو آ

تو ہے شمشیر تجھے زنگ نہ لگ جائے کہیں
گر عیاں جنگ میں جوہر تجھے کرنے ہیں تو آ

تیغِ قاتل سے ٹپکتا ہے وہی آبِ حیات
دہنِ زخم کے لب تر تجھے کرنے ہیں تو آ

چپہ چپہ ہے زمینِ حسن کی دشوار گزار
معرکے عشق کے گر سر تجھے کرنے ہیں تو آ

ہر قدم پر ہے یہاں ایک صنم خانۂ حسن،
دل و دیں نذرِ صنم گر تجھے کرنے ہیں تو آ

فتح پانی ہے اگر عشق کے میداں میں تو چل
طے اگر خوں کے سمندر تجھے کرنے ہیں تو آ

بے سپر صبر ترا، تیغ رواں بھی ہے یہی
منتشر جبر کے لشکر تجھے کرنے ہیں تو آ

دور سے دور ہے پھیلی ہوئی قدرت کی فضا
وا اگر عقل کے شہپر تجھے کرنے ہیں تو آ

(رسالۂ ہمایوں، جون ۱۹۲۳؁ء۔ جلد ۳ نمبر ۶ صفحہ ۴۱۴)

تُو اور مَیں

تو نغمہ چاہتا ہے، فغاں چاہتا ہوں میں
تو چاہتا ہے جو، وہ کہاں چاہتا ہوں میں

چہرہ پہ چاہتا ہے مسرّت کی لہر تُو
سینے میں ایک برقِ تپاں چاہتا ہوں میں

تو چاہتا ہے یہ کہ دہن گل فشاں رہے
جس سے شرر جھڑیں وہ زباں چاہتا ہوں میں

تو چاہتا ہے دل کو سکوں ہو ترے نصیب
بیتاب دمبدم رگِ جاں چاہتا ہوں میں

تو چاہتا ہے دیدۂ ظاہر ہو محوِ خواب
باطن میں دیدۂ نگراں چاہتا ہوں میں

شیخِ حرم سے گر تجھے زمزم کی ہے طلب
پیرِ مغاں سے رطلِ گراں چاہتا ہوں میں

تو چاہتا ہے سایۂ گل میں ہوائے سرد
شاخِ چنار شعلہ فشاں چاہتا ہوں میں

تُو زندگی کے ساحلِ خاموش پر مقیم
گردابِ زندگی کا سماں چاہتا ہوں میں

دل میں ترے ہے راحتِ پیرانہ کی اُمنگ
جذباتِ تیز و تند و جواں چاہتا ہوں میں

آسانیوں میں ہے تری خودداریوں کا راز
دشواریاں گُسستہ عناں چاہتا ہوں میں

منبر پہ تجھ کو جلوۂ واعظ کا اشتیاق
سُولی پہ رازِ حق کو عیاں چاہتا ہوں میں

تو چاہتا ہے دل ہو ترا لالہ زارِ عیش
اُٹھتا ہوا جگر سے دھواں چاہتا ہوں میں

دُنیا مسرّتوں کی ہے درکار گر تجھے
بیتابیوں کا ایک جہاں چاہتا ہوں میں

(رسالہ "ہمایوں" جنوری ۱۹۲۹ء۔ جلد ۱۳ نمبر ۱۔ صفحہ ۸۶)

تنہا بادل

کیا برق و باد کا طوفاں تھا | تھی جس سے فضا میں مچی ہلچل
اب تو ہی نشانی ہے باقی | طوفان کی اے تنہا بادل
سایہ ہے ترے ہر غم کا سماں | چھایا ہوا بام و در پہ یہاں
ہے روشنی دن کی ابھی دھندلی | پردے میں ابھی کرنیں ہیں نہاں
ہیں گزرے ابھی چند اک لمحے، | تھی چھائی جب گھنگھور گھٹا
تھی بارش کی پُر زور جھڑی | تھا بجلیوں کا طوفاں برپا
دل تیری گرج سے دہلتے تھے | لرزہ تھا پڑا جانداروں میں
گویا تھا سمندر ٹوٹ پڑا | پانی کی ٹپکتی دھاروں میں
بس کام ترا اب ختم ہوا | سر پر سے گزر جا اے بادل
طوفاں کا نہیں اب نام و نشاں | نقشہ ہے گیا دنیا کا بدل
چلتی ہے درختوں پر جو ہوا | لے جائے گی تجھکو دو رہٹا
باقی نہیں اب کچھ کام ترا | کیوں سر پہ بلا بن کر ہے کھڑا

(”مودھ اخبار“ ۱۲۔اپریل ۱۹۲۵ء)

سمندر

سمندروں میں جب آتا ہے جوش وقتِ تلاطم
تو دیکھتا ہوں میں، لہروں کا خوفناک تبسّم
اِدھر سے زیر و زبر کرتا، مچھلیوں کو سمندر
اُدھر نہنگ لگاتے ہیں، موجِ خیز میں چکّر
اُلٹتی کشتیاں ہیں، ڈوبتے ہیں کشتیوں والے
مسافروں کو ہے کرتی، قضا اجل کے حوالے
اُچھالتی ہیں جو طوفاں میں، پانیوں کو ہوائیں
ہزار توپ کے دغنے کی، سن رہا ہوں صدائیں
ہوناخدا ہیں۔ بجا ہوش اُن کے رہ نہیں سکتے
جو ہیں بلازدہ، وہ آسرا خدا کا ہیں تکتے،
خدا کی عظمت و جبروت کا ہے تخت سمندر
ہے اُس کی روح، جو پنہاں ہے موج موج کے اندر
بشر کا علم و ہنر، آگے اُس کے چل نہیں سکتا

وہ اس کے سَیل کی رفتار کو بدل نہیں سکتا،
وہ تیور اس میں ہیں اُس کے جلال وقہر کی شانیں
کہ اُس سے کانپتی رہتی ہیں، ناخداؤں کی جانیں
جہاز سطح پہ اُس کی، ہیں گر غرور سے چلتے
تو تیور اُس کے یکایک، عتاب سے ہیں بدلتے
طمانچے ایسے لگاتی ہے اُٹھ کے موجِ تلاطم
کہ ہوتے ہیں وہ سمندر میں، بلبلوں کی طرح گم
جہاز راں بھی نہیں بچتے، اُس کی سیلِ فنا سے
غضب کا شیوہ یہ سیکھا ہے اُس نے قہرِ خدا سے
خزانے ہیں زر و جوہر کے، اُس کے پیٹ میں پنہاں
جو نذر دے گئے ہیں اُس کو ڈوب ڈوب کے انساں
سمندر اے دلِ خالق کے اضطراب! سمندر!
چھپے تو رکھتا ہے کیا انقلاب، سینے کے اندر
غرورِ عقلِ بشر کے، ڈبو چکا ہے تو لاشے
اب اور دیکھئے کیا کیا دکھائیگا تو تماشے

(اودھ اخبار ۳۰ مئی ۱۹۲۴ء)

فیضِ ازل

حُسن کے جلوہ زار میں، روشنیاں ہیں بیکراں — موج پہ موج ضو کی ہے، چار طرف رواں دواں
روشنیوں میں ہے گھرا، چار طرف سے ہر بشر — آنکھ مگر کھلی نہیں، پردہ میں ہے چھپی نظر
لُطفِ ہوا سے بُو پہ بُو، پھیل رہی فضا میں ہے — معجزہ نوبہار کا، جلوہ گر اس ہوا میں ہے
عکس مشام پر مگر، جب نہ پڑے شمیم کا — کیجیے کس سے تذکرہ، تازگیٔ نسیم کا
دوشِ ہوا پہ دوڑتے، گرچہ ہیں زمزمے سدا — ساز ہے کائنات کا، لیل و نہار پُرصدا
پردۂ سامعہ میں جب، ہو نہ ذرا بھی ارتعاش — کس کو سنائیں ہمنوا! ہے یہ ترانہ دلخراش

فیضِ ازل ہے برملا، تم میں کشش مگر نہیں
ہے وہ تمھارے آس پاس، تم کو مگر خبر نہیں

("اُودھ اخبار"۔ ۲۴ مئی ۱۹۲۴ء)

باغِ خُلد

کس قدر بلندی پر، تھا کبھی مکاں میرا
شاخِ سبزِ طوبیٰ پر، تھا اک آشیاں میرا

ہمصفیر میرے تھے، طائرانِ روحانی
باغِ خلد میں تھا میں، محوِ زمزمہ خوانی

حوریں کس مسرّت سے، گود میں بٹھاتی تھیں
زمزمے مرے سُنکر، خود بھی سر ہلاتی تھیں،

صُبح کی ہوا ہر دم، جنتوں میں چلتی تھی
دھوپ چھاؤں رنگ اپنا، کب وہاں بدلتی تھی

شہد و شیر کی نہریں، ہر چمن میں تھیں جاری
دلکشی کا اک عالم، تھا بہشت پر طاری

تھا وہ لُطف کا منظر، تھا وہ عالمِ شادی
تھا وہ وقتِ بیفکری، تھا وہ عہدِ آزادی

دامگاہِ دُنیا میں، جب سے میں پھنسا آکر
عیش کا زمانہ وہ، ہو گیا رفوچکر

نور تھا وہاں پھیلا، ظلمتیں ہیں یاں چھائی
یاں یہ وحشت و زشتی، واں وہ عیش و زیبائی

طائرانِ قدسی ہیں، رنج سے مجھے تکتے
پر قفس کی تنگی سے، میرے کُھل نہیں سکتے

اب بجائے بیفکری، فکر مجھ پہ ہے طاری
اب بجائے نغمہ ہے، لب پہ نالہ و زاری

موت پر ہوں آمادہ، زندگی سے ہوں سیری
اے بہشت کی روحو! کچھ مدد کرو میری

("اودھ اخبار" ۲۵ مئی ۱۹۲۴ء)

دمِ واپسیں

سرھانے اک مریض کے شمع زرد جل رہی
برنگِ موئے ناتواں، ہے نبض اُس کی چل رہی
نہیں ہے طاقت اُس میں اب کہ کروٹیں بدل سکے
علاج کیا ہو اس گھڑی، کہ وقتِ موت ٹل سکے
یکایک اُس کے چہرہ پر جھلک سی آکے رہ گئی
جو زندگی کی موج تھی، وہ تلملا کے رہ گئی
لبوں سے "آہ زندگی"!! کی اک صدا نکل گئی
کسی کی آئی یہ صدا، کہ "لو ہوا نکل گئی"

شباب اس مریض کا تھا عیش میں بسر ہوا
مگر نہ رازِ عیش سے، کبھی وہ باخبر ہوا
سمجھتا تھا کہ، زندگی، ہے ایک عیشِ جاوداں
نظر میں اُس کی جلوہ گر، سدا رہیگا یہ سماں

نہ حُبِّ ذات کے سوا کسی سے اُس کو کام تھا
شراب سے غرور کی، وہ سب بے خبر مُدام تھا
نہ حُبِّ ملت اُس میں تھی، نہ اُس میں اُلفتِ وطن
نہ ملک کی اُسے خبر، نہ قوم کی اُسے لگن
کُھلا یہ وقتِ جاں کنی، کہ کچھ نہ تھی یہ زندگی
نہ تھا وہ چشمۂ بقا، سراب کی تھی روشنی،

جو ہوتی ملک و قوم کی، محبت اُسکی ذات میں
تو وقتِ مرگ تیرتا، وہ چشمۂ حیات میں

("اودھ اخبار" ۲۳ مئی ۱۹۲۴ء)

جلوے

یہ زمیں پر چمنستاں، وہ بلندی پہ ستارے — مرے دل سے کوئی پوچھے، تو یہ جلوے ہیں تمھارے

کبھی خوشبو کی اگر لہر سی پاتا ہوں فضا میں — تو سمجھتا ہوں کہ تم، بال سکھاتے ہو ہوا میں

نظر آتی ہے سحر کی، جو سفیدی سی افق پر — تو سمجھتا ہوں کہ منہ دھوتے ہو تم نیند سے اُٹھ کر

کبھی جھونکے جو ہوا کے ہیں مجھے راگ سناتے — تو سمجھتا ہوں کہ تم صحن گلستاں میں ہو گاتے

کبھی بھرتی ہے اگر برق، گھٹاؤں میں طرارے — تو سمجھتا ہوں کہ تم کرتے ہو شوخی کے اشارے

کبھی طوفاں کا سمندر میں جو پاتا ہوں اشارا — تو سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ہے کوئی کھیل تمھارا

کبھی گر دیکھتا ہوں، زلزلہ دنیا پہ ہے طاری — تو سمجھتا ہوں کہ یہ قہر کی عادت ہے تمھاری

غرض آنکھوں سے مری، جو کوئی اس دہر کو دیکھے — وہی اس لطف کو سمجھے، وہی اس قہر کو دیکھے

یہ تمھیں ہو کہ پسِ پردہ سے کرتے ہو اشارے

کہ سدا ڈور تماشے کی ہے، ہاتھوں میں تمھارے

("اودھ اخبار" ۲۷ مئی ۱۹۲۴ء)

گوشۂ تنہائی

اے خلوتِ خاموشی، اے گوشۂ تنہائی — فطرت کی بلندی ہے، تُو نے مجھے دکھلائی
جس ذہن میں جودت ہو، جس دل میں ہو جولانی — جمہور میں پھنس کر وہ، ہو جائے گا زندانی
کھائے گا ہوا کیونکر، وہ عالمِ بالا کی — ہوں پاؤں میں زنجیریں جب صحبتِ دنیا کی
ہر طبع رواں دب کر، جمگھٹ میں کچل جاتی — برگد کے تلے آ کر، ہے گھاس بھی جل جاتی
جو ذہن کہ خلوت میں، کر سکتے تھے ایجادیں — جلوت میں وہ جب پہنچے، سب گر گئیں بنیادیں
خلوت میں ہے خاموشی، جلوت میں ہیں آوازیں — جلوت میں ہے مایوسی، خلوت میں ہیں پروازیں

خاموشی و تنہائی، الہام کے چشمے ہیں
پنہاں پسِ پردہ ہیں، قدرت کے کرشمے ہیں

("اودھ اخبار" ۲۱ مئی ۱۹۲۴ء)

نیم کے پتّو

جب نیم کی شاخیں ٹھنڈی ہوا کھا کھا کے تھرکنے لگتی ہیں
پھر زرّیں کرنیں سورج کی، پتّوں پہ چمکنے لگتی ہیں

پتّوں کی رگوں میں نیم کا رس اِک دوڑ تا پوری سرعت کر
یہ ریشہ دوانی دیکھ کے میں، تصویر بنا ہوں حیرت سی

کیا فیضِ الٰہی کی کرنیں، پڑتی نہیں مجھ پر شام و سحر؟
کیا موجِ نسیمِ رحمتِ حق، چلتی نہیں مجھ پر آٹھ پہر؟

پھر کیا ہے کہ نیم کا جوشِ نمو پاتا نہیں اپنے سینے میں
دل مردہ ہے، افسردہ ہے، مشغول نہیں رس پینے میں

محروم ہے فیض سے دل میرا، فیضان میں تم غرقاب رہو
اے نیم کے متوالے پتّو! سرسبز رہو، شاداب رہو

("اودھ اخبار" ۱۸ مئی ۱۹۲۴ء)

فلسفۂ مصائب

اک بچہ کی بغل میں، دُنبل ہوا نمایاں
بیتابیوں سے اُس کی، ماں باپ تھے پریشاں

جرّاح کو بُلا کر، چیرا اگر دِلاتے
اُلجھن سے رات دن کی اک بار چھُوٹ جاتے

لیکن یہ مامتا ہیں دیکھا نہ اُن سے جاتا
پھوڑے کے چیرنے سے بچّہ جو تلملاتا

آخر کو رفتہ رفتہ دُنبل یہ رنگ لایا
تھا گور کے کنارے گو دوں کا وہ کھلایا

فاسد مواد کو جب روکا بدن کے اندر
ممکن نہ تھا کہ بچہ، ہو سکتا اُس سے جانبر

قوموں کے جسم میں بھی فاسد مواد یونہی
ہوتا ہے جمع جس دم، لاتا ہے وہ تباہی

لازم ہے یہ کہ جنگیں، درپیش اُن کو آئیں
قحطوں کی، زلزلوں کی، یا آفتیں اُٹھائیں

ہے حادثوں میں پنہاں حکمت کا اک اِشارا
جرّاحیاں ہیں گویا، قدرت کی آشکارا

نشتر سے حادثوں کے، چیرے نہ گر وہ پھوڑے
فاسد مواد اُن کو، زندہ کبھی نہ چھوڑے

(اودھ اخبار - ۲۹ مئی ۱۹۲۴ء)

کر دل کے حرم کا طواف سدا

ایمان کہاں جاتا ہے ترا، اس خوف سے ترکِ جام نہ کر
گر پختہ نظر ہو جائے تری، تو دل میں خیالِ خام نہ کر

خالی مئے حبِّ وطن سے نہ ہو، یہ جام جو ہے ساقی نے دیا
مجھ میکش کے دل پر یہ ستم، اے طالعِ نافرجام نہ کر

پھندے ہیں جو حسنِ مجازی کے، بچ اُن سے جہاں تک ممکن ہو
آزاد ہے مرغِ روح ترا، تو اس کو اسیرِ دام نہ کر

اسرارِ ازل کے فلسفہ کو، سمجھے گی نہ ہرگز عقل تری
پھسلے ہیں قدم عقلوں کے جہاں، اُس راہ میں تو اقدام نہ کر

ناکامی کام ہے مردوں کا، نامرد ہیں جو کامی ہیں یہاں
ہمت ہے اگر تو دل کو کبھی، جذباتِ ہوس کا رام نہ کر

جو عیش طلب ہیں عیش اُن کا، ہوتا ہے بدل کر طیش سدا
آرام سے ہیں دن کاٹنے گر، تو ایک گھڑی آرام نہ کر

مستور ہے خانۂ دل میں وُہی، ہیں جس کی تلاش میں یہ حاجی
کر دل کے حرم کا طواف سدا، کعبہ کے لئے احرام نہ کر

(" اودھ اخبار " ۱۱ رجنوری ۱۹۲۵ء)

نوجوانوں سے!

خاکِ ناچیز ہو گر، دشت میں چکّر نہ لگاؤ
بحرِ مردار ہو تم، گر کوئی طوفاں نہ اٹھاؤ
نوجوانو! تمھیں ہم مُردہ یقیں کر لیں گے
اپنی ہستی سے نہ دُنیا میں اگر دھوم مچاؤ
وقت ہے چِلّہ چڑھانے کا۔ نشانے تاکو
چٹکیوں میں نہ عبث۔ اپنی جوانی کو اُڑاؤ
جوش کی ہیں جو اُمنگیں، اُنھیں ہمیز کرو
عیش کی ہیں جو ترنگیں، اُنھیں سینوں میں دباؤ
بدلیاں غم کی ہوں چھائی، تو سراسیمہ نہ ہو
بجلیاں زر کی لپکتی ہوں، تو جھل بل میں نہ آؤ
پاؤں جم جم کے رہِ حُبِّ وطن میں رکھو
سکّہ تھم تھم کے تم اپنا دلِ عالم پہ جماؤ
ناامیدی سے اندھیرا نہ فضا میں چھا جائے

ٹھنڈی سانسوں سے چراغِ دلِ روشن نہ بجھاؤ

جس خزانے کو ہے غفلت سے کیا گم تم نے

ڈھونڈتے تم رہو، جب تک کہ پتا اس کا نہ پاؤ

کب تک اغیار کی صنعت پہ رہو گے حیراں

اپنی ہمت کا مرقع، کوئی دنیا کو دکھاؤ

نقش غیروں کے جو دل پر ہیں مٹا دو اُن کو

محفلِ گردشِ ایام میں، رنگ اپنا جماؤ

("اودھ اخبار" ۱۱ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء)

صبح کا سماں

اُٹھا فرشِ خواب سے میں، جونہی آنکھیں اپنی ملکر
مجھے نور کا سمندر نظر آیا آسماں پر

وہ جو صُبح کا سماں تھا، نہیں اُس کو بھولتا میں
لگا دیکھنے نظارے، لگا سونگھنے ہوائیں

وہ گلوں کی روشنی سے، نظروں کا دنگ ہونا
وہ برنگِ باغ رضواں چمنوں کا رنگ ہونا

وہ شمیم عطرِ گل کا، سرِ رہگزر مہکنا
وہ نسیمِ مشک چیں کا، لبِ غنچہ سے لپکنا

وہ چمن کے طائروں کا، سرِ شاخ چہچہانا
وہ گیاہِ سبز و تر کا، لبِ جُو پہ لہلہانا

وہ مرا جنوں میں کہنا، کہ "تم آؤ گر چمن میں"
تو عجب چہل پہل سی، ہو گلوں کی انجمن میں"

مرے کہتے ہی یکایک، وہ تمھارا آنکلنا
وہ تمھارا ہنس کے کہنا، کہ "ذرا چمن میں چلنا"
کبھی پھول سونگھتا تھا، کبھی تم پہ تھا فدا میں
وہ جو صبح کا سماں تھا، نہیں اُس کو بھولتا میں

("اودھ اخبار" ۲۴ مئی ۱۹۲۴ء)

"جانِ جہاں" کی تلاش

آئے گا ایک روز وہ، جبکہ اجل آئیگی — میری تمناؤں پر، تیرگی چھا جائے گی
بعد میرے آفتاب، ہوگا یونہی جلوہ گر — رات کو پھیلائے گا، روشنی اپنی قمر
صبح یونہی آئے گی، شام یونہی آئیگی — گردشِ دورِ زماں، رنگ یونہی لائیگی
آئے گی فصلِ خزاں، آئے گی بادِ بہار — گرمی و سردی یونہی، آئے گی لیل و نہار
بادلوں کی آئے گی، یونہی فلک پر قطار — بجلیاں ہوں گی یونہی، بادلوں میں بیقرار
زمزمے مرغِ چمن، یونہی سدا گائیں گے — پھول یونہی باغ میں، رنگ نیا لائیں گے
میری نظر سے مگر، ہوگی یہ دُنیا نہاں — اک نئی دُنیا ہے وہ، ہوں گا میں جس دم جہاں
مِل گیا مجھکو اگر، وہ جو ہے مدِ نظر — پھر نہیں پروا، گئی چھوٹ یہ دُنیا اگر
لطف یہاں کے جو ہیں، اُس پہ وہ قربان ہیں — اُس پہ فدا سب مرے عیش کے ارمان ہیں

ورنہ مری "جان" ہیں، ہے یہ تمنا نہاں
ڈھونڈ کے رہیے اُسے، جو کہ ہے "جانِ جہاں"

("اودھ اخبار" ۲۸ مئی ۱۹۲۴ء)

"یہی تو وہ ادا میری ہے میں خود جس پہ مرتا ہوں"

تماشائے جمالِ یار کا، جب عزم کرتا ہوں،
نہیں معلوم اپنی دھن میں کیا کیا گل کترتا ہوں
مسیحا "قم" کہیں، اور زندہ ہو کر میں اٹھوں توبہ!
یہی تو وہ ادا میری ہے، میں خود جس پہ مرتا ہوں
تحائف چند نادر بھیجتے ہیں حسن والوں کو
تمناؤں کی تصویروں میں بیٹھا رنگ بھرتا ہوں
مبادا دیکھکر اس کو، مچل جائیں مرے ارماں
میں افسوں پڑھ کے دم اپنی نظر پر آپ کرتا ہوں
عجب انداز استغنا سے وہ کہتا ہے انساں سے
کبھی میں عرش پر چڑھتا، کبھی دل میں اترتا ہوں
سمجھ کر ناخدا دامن خودی کا ہوں پکڑ لیتا
کبھی گر خود فراموشی کے دریا سے ابھرتا ہوں

تماشا دیکھنے کو اپنے حسنِ مہر آسا کا
شعاعیں بن کے جولاں گاہِ ہستی میں بکھرتا ہوں

خدا ہے جب، تو ہو اپنی خودی کا کیوں یقیں مجکو
میں اک سایہ ہوں، اور سورج کے آگے سے گذرتا ہوں

ورق یہ صحفِ گل کے بکھر جائیں نہ مٹّی پر
نسیمِ صبح جب کرتی ہے شوخی، دل میں ڈرتا ہوں

حقیقت کے حرم تک گر رسائی ہو تو کیونکر ہو؟
طواف اپنے بُتِ پندار کا، ہر لحظہ کرتا ہوں

نہیں اس ہستیِ پُر آرزو کو میری چین اک دم
سنور کر میں بگڑتا ہوں، بگڑ کر میں سنورتا ہوں

("اودھ اخبار" ۲۰ اپریل ۱۹۲۶ء)

رنگِ تغزّل

غیروں نے کبھی تم کو مُکرتے نہیں دیکھا — پر ہم نے کبھی وعدہ بھی کرتے نہیں دیکھا
کیا سمجھے گا اس غمزہ کی شوخی کو وہ جس نے — سینوں سے سنانوں کو گزرتے نہیں دیکھا
اس درجہ نڈر ہو جو ستم کرنے میں ہم پہ — شاید کسی جاں باز کو مرتے نہیں دیکھا
سو کر جو اُٹھا وہ، تو ہوا صبح کا منہ فق — یوں خوف سے چہروں کو اُترتے نہیں دیکھا
اے نفس جھپٹ عقل پہ تیری ہے بلا کی — یوں شیر کو غصے میں بپھرتے نہیں دیکھا
ڈوبا ہے اگر چاند، تو سو بار ہے اُبھرا — دل ڈوب گیا جو، تو اُبھرتے نہیں دیکھا
عاشق کی شبِ غم کو نہ سمجھے گا وہ شاید — جس نے تری زلفوں کو بکھرتے نہیں دیکھا
کیا جانے تری مستیِ انداز کو ساقی! — مے جس نے تجھے جام میں بھرتے نہیں دیکھا
جاں بازیِ اُلفت سے جو ڈرتے رہے اے خضر! — اُن کو قدم اس دشت میں دھرتے نہیں دیکھا
دانوں کو جو خرمن کے فراہم نہیں کرتے — بجلی سے کسی نے اُنھیں ڈرتے نہیں دیکھا
یوں ہم پہ بگڑتے ہیں جو یہ حضرتِ واعظ! — شاید کسی مہوش کو سنورتے نہیں دیکھا
دی کاٹ زباں شیخ کی اک رند نے جس طرح — گُل شمع کا یوں ہم نے کترتے نہیں دیکھا

جوبن پہ جب بٹ لئے یہ اترائے ہوئے ہیں   پھولوں نے شباب اُن کا نکھرتے نہیں دیکھا

رہتا ہے سلیم اپنی کسی دُھن میں ہمیشہ
ہم نے تو کوئی کام اُسے کرتے نہیں دیکھا

("اودھ اخبار" ۔ ۲۷۔ اپریل ۱۹۲۴ء)

"حورانِ جناں نے بھی نہ پایا دہن ایسا"

مہکا ہوا آمد سے تری ہے چمن ایسا
ہو گا نہ معطر کبھی دشتِ ختن ایسا

داغوں سے بھرے دل لئے عاشق ہیں ترے گرد
گلدستہ نہ دیکھے گی کوئی انجمن ایسا

اک شیشۂ فولاد ہے، اک پارۂ بلّور
ہو گا کسی دلبر کا دل ایسا نہ تن ایسا

سایہ سے نظر کے بھی بگڑتا ہے ترا رنگ
پھولوں نے بھی پایا نہیں نازک بدن ایسا

ہر عضو بدن ہے ترا فوارۂ سیماب
دیکھا نہیں دنیا میں کوئی سیمتن ایسا

حُسن اُسکا تو رنگیں ہو، مگر دل نہ ہو سنگیں
بُت تو نے ہے دیکھا کوئی اے برہمن ایسا؟

ہونٹوں سے اُبلتا ہے ترے چشمۂ کوثر
حورانِ جناں نے بھی نہ پایا دہن ایسا

چڑھتی ہوئی قوموں کو اُترتا ہوا دیکھیں
دکھلا دے کوئی شعبدہ چرخ کہن ایسا

بپھرے ہوئے شیروں سے لڑاتے ہیں نظر وہ
تیور پہ غزالوں کے ہے اب بانکپن ایسا

عقبیٰ کا اُسے خوف، نہ دُنیا کی ہے پروا
ہے شیفتہ تیرا کسی دُھن میں مگن ایسا

پیتا ہوں میں جو زہر، وہ تریاق کا دے کام
اے چارہ گرو، کوئی بتا دو جتن ایسا

ہے فکر کی ظلمت دلِ روشن پہ ہمارے
تاروں کو نہ تقدیر دکھائے گہن ایسا

واعظ کو دکھا دینگے ہم اِک گلبدن ایسا   ہو دل پہ پڑے اوس پھبن دیکھ کے جسکی

دی مات دہن نے ترے غنچوں کو تسلیم آج
شاعر نہیں دیکھا کوئی رنگیں سخن ایسا

("اودھ اخبار" ۱۱ مئی ۱۹۲۸ء)

اشتہار

اے اشتہار! تیرا بلندی پہ ہے نشاں — سکہ ترا دیارِ تجارت پہ ہے رواں
پھیلا تجھی سے نورِ تجارت کا چار سُو — ہیں صنعتیں تجھی سے یہ مشہور کُو بکُو
تاجر تری امید پہ بیٹھے ہیں سر جھکائے — ہیں منتظر کہ تو رخِ دولت انھیں دکھائے
تو وہ دُلھن ہے، جلوہ دکھاتی ہے جب ذرا — لیتی ہے لینے شائق جلوہ سے رونما
آتی ہے تیری دولتِ دیدار جن کو راس — آتے ہیں کھنچ کے دور سے گنجِ زر اُن کے پاس
آہن رُبا ہے کھینچتا لوہے کو جس طرح — دولت کو کھینچتی ہے تری طاقت اس طرح
جب کھولتا ہے تو کسی تاجر کے مال کو — دیتا ہے کھول اپنی زبانِ مقال کو
کیا دل فریبیاں ہیں ترے ہر بیان میں — جادو کا ہے اثر تری شیریں زبان میں
تو مال کے جمال کو کرتا ہے جلوہ گر — ہلتا تری صدا پہ ہے ہر مشتری کا سر
تصویرِ مال کھینچ کے دیتا ہے تو دکھا — بھرتا ہے اُس میں رنگ ہر شوخی سے جابجا
ہر مشتری کی اُس پہ پہنچتی ہے جب نگاہ — بے اختیار مُنہ سے نکلتا ہے واہ واہ
غنچے کی طرح اس کو سمجھ کر ہوا کے مول — دیتا ہے مُشتِ زر کو وہ بے اختیار کھول

جس طرح تو مصورِ جادو نگار ہے — شاعر بھی تو اسی طرح اے اشتہار ہے
ہاتھ اپنا کر کے مال کی تصویر پر رواں — زورِ بیاں سے اس کی دکھاتا ہے خوبیاں
دو جادو ایک ساتھ ہوں جب جمع اِس طرح — قابو ہو مشتری کو دل و جاں پہ کس طرح
اے اشتہار! تو نہ ہو دم بھر جو گرمِ کار — بازار سرد ہوں ابھی دُنیا کے ایک بار
تیرے ہی دم قدم سے ہیں چلتی تجارتیں — تیری اشارتوں سے اُبھرتی ہیں صنعتیں
اخبار اُڑ کے جائیں نہ دُنیا میں چارسو — اُن کے لئے اگر پرِ پرواز ہو نہ تو
سرکے نہ تو، تو بند ہوں اخبار سر بسر — حاصل ہے اُن کو تیری بدولت یہ زور و زر
اے اشتہار! بند نہ کر اپنی حرکتیں — ان تیری حرکتوں سے تیری نمایاں ہیں برکتیں
گر سلسلہ ہو بند تجارت کا ناگہاں — بھوکوں کے حلق سے ابھی اُٹھنے لگے دُھواں
اخبار کا ہو سلسلہ گر بند ایک بار — اندھیر ہو جہاں میں جہالت کا آشکار

یہ دونوں سلسلے ہیں غرض تیرے دم کے ساتھ
دولت کے اور علم کے سر پر ہے تیرا ہاتھ

("اودھ اخبار" ۱۰ فروری ۱۹۲۴ء - بحوالہ "المشتہر")

محبت کی عالمگیری

دُنیا نہیں غافل! ہے یہ اُلفت کا سمندر
جذبہ ہے محبت کا ہر اِک ذرّے کے اندر

ہر شے کی ہے کوشش کہ کشش اپنی دکھائے
جو شے ہو گریزاں، اُسے اپنے سے ملائے

چشمے جو پہاڑوں کی ہیں درزوں سے اُبھرتے
دریاؤں سے ملنے کو ہیں میداں میں اُترتے

دریا بھی سمندر کی محبت میں رواں ہیں؛
بے چینیاں ہر موج کے تیور سے عیاں ہیں

چلتی ہیں اگر مشرق و مغرب سے ہوائیں
یہ دُھن ہے کہ اُلفت سے بہم ہاتھ ملائیں

اشیا میں غرض باہمی اُلفت کا ہے جوش
غایت ہے یہی سب کی کہ ہو جائیں ہم آغوش

پھر تو ہی بتا تجھ سے رہوں دُور میں کیونکر
دُکھ تیری جدائی کے یہ آخر سہوں کیونکر

وہ دیکھ! پہاڑوں کی جو ہیں چوٹیاں اونچی
سرگوشیاں ہیں ابرِ سیہ فام سے کرتی

دریاؤں کی موجوں پہ نظر ڈال، کہ باہم
ہوتی ہیں ہم آغوش، یہ اُلفت کا ہے عالم

پھولوں کو ذرا دیکھ کہ کیا رنگ ہیں لائے
کس شوق سے کانٹوں کو بغل میں ہیں دبائے

سورج بھی نکلتا ہے اگرچہ چرخِ بریں پر
ہر ایک کرن اُس کی لپکتی ہے زمیں پر

اُلفت کرۂ خاک سے ہے مہرِ مبیں کو
کس شوق سے ہے چومتا وہ روئے زمیں کو

چاند اور سمندر میں بھی اُلفت کی لگن ہے — پانی پہ فدا چاند کی ہر ایک کرن ہے
مد کیا ہے؟ سمندر کی محبت کا ہے اک جوش — موجوں کو کیا جس نے شعاعوں سے ہم آغوش
کیا قہر ہے؟ دُنیا تو مزے وصل کے لُوٹے — اور مجھ سے ترے ربط کا یوں سلسلہ ٹوٹے
کیا دل نہیں موجود مرے سینے کے اندر؟ — کیا دل میں نہیں موجزن اُلفت کا سمندر؟

تُو اور میں یکجا ہوں، تمنا ہے تو یہ ہے
فطرت کی اُمنگوں کا تقاضا ہے تو یہ ہے

("الناظر" لکھنؤ - جلد ۲۶ - نمبر ۵-۶ - ۱۵ جون سنہ ۱۹۲۷ء صفحہ ۲۸)

رقاصہ

وہ حُسن کی پُتلی جو تھرکتی نظر آئی
پھولوں کی چھڑی تھی کہ لچکتی نظر آئی
وہ حُور کہ تھی فرشِ قلم کار پہ رقصاں
شبنم تھی کہ پھولوں پہ ڈھلکتی نظر آئی
چال اُس کی قیامت نے جو دیکھی سرِ محفل
سوتے ہوئے فتنوں کو تھپکتی نظر آئی

(زبانی خواجہ امیر احمد صاحب)

"سجدہ کرتا ہوں وضو کر کے مئے ناب سے میں"

درسِ تسکیں کا ہوں پاتا دلِ بیتاب سے میں
پیاس پیتا ہوں بجھا چشمۂ سیماب سے میں

نغمۂ گرم کہاں پردۂ دل سے ہو بلند
چھیڑتا ہوں نفسِ سرد کی مضراب سے میں

حُسن تیرا بھی نظر آتا ہے بیدار مجھے
دیکھتا ہوں جو تجھے دیدۂ بیخواب سے میں

ہر بُنِ مو سے ٹپکتا ہے مرے قطرۂ خوں
بچ کے نکلا ہوں تمنّا کے بھنور گرداب سے میں

ذرہ ذرہ ہو فنا گرمیٔ ہستی کا تو ہو،
مُنہ نہ پھیروں گا کبھی مہرِ جہانتاب سے میں

ہیں در و بام مرے گھر کے اُدھر رقص کُناں
مست و بیخود ہوا اِدھر نغمۂ سیلاب سے میں

بزم کرتا ہوں بپا دِل میں تمناؤں کی
تنگ آتا ہوں گر صحبتِ احباب سے میں

حُسن کا تیرے تصور جو شبِ غم ہے مجھے
سر سے تا پا ہوں بھرا جلوۂ مہتاب سے میں

کرنی پڑتی ہے ادا جب درِ ساقی پہ نماز
سجدہ کرتا ہوں وضو کر کے مئے ناب سے میں

دیکھنا یہ ہے کہ زنجیر ہلاتا ہے یہ کون
پار جاتا ہوں اُدھر عالمِ اسباب سے میں

بحرِ افکار میں غوطہ جو لگاتا ہوں سلیم
رہتا محروم نہیں گوہرِ نایاب سے میں

"پھر تازہ میرے سینہ میں داغِ کہن ہوا"

پھر رشکِ صحنِ روضۂ رضوان چمن ہوا
پھر شاخِ گُل پہ مرغِ چمن نعرہ زن ہوا

ہر پھول مُشکِ نافۂ دشتِ ختن ہوا
ہر چشمہ مثلِ چشمۂ نہرِ لبن ہوا

ہر طائرِ چمن کا ہوا تازہ ولولہ
ہر شاہدِ چمن کا نیا پیرہن ہوا

موتی بہ تجمل کے رہ گئے خجلت سے جس گھڑی
شبنم کا قطرہ زینتِ برگِ سمن ہوا

اک سُو دکھائی تیغِ رواں موجِ نہر نے
اِک سُو ظہورِ لالۂ خونیں کفن ہوا

نرگس کی آنکھ ایک طرف سُرمہ سا ہوئی
سنبل کا طُرّہ ایک طرف پُرشکن ہوا

القصہ دی خزاں کو ہزیمت بہار نے
دُنیا پہ پھر عیاں کرمِ ذوالمنن ہوا

پرتو سے تیرے حُسن کے تارِ نظر مرا
روشن ہوا تو نُورِ سحر کی کرن ہوا

بُلبُل نہ تیری موت پہ رشک آئے کیوں مجھے
تیرا کفن ہوا بھی تو برگِ سمن ہوا

پھولوں کی آب و تاب پہ شبنم برس گئی،
جب جلوہ گر چمن میں وہ رشکِ چمن ہوا

ہے وہ غلام، ہے جسے دُنیا و دیں کی فکر
آزاد وہ ہے جو تری دھن میں مگن ہوا

ہنگامے جلوتوں کے سبھی سرد پڑ گئے
خلوت میں کون مجھ سے یہ گرمِ سخن ہوا

پھر کوندتی ہیں وادیِ سینا میں بجلیاں
پھر تازہ میرے سینے میں داغِ کہن ہوا

پھولوں سے کھیلنے لگیں اس کی نزاکتیں
جب مائلِ خرام وہ گُل پیرہن ہوا

اُلجھاؤ دیکھیے ابھی کیا کیا ہیں عشق میں
دو چار ہی قدم پہ یہ رستہ کٹھن ہوا

دل ہو کے چاک چاک مرا فکرِ شعر میں
آج اے سلیم شانۂ زلفِ سخن ہوا

(رسالہ "ہمایوں" جنوری ۱۹۲۶ء۔ جلد ۹ نمبر ۱۔ صفحہ ۲۸)

شوخیِ حُسن

جب نگاہِ مست ساقی کام اپنا کر گئی   موج میری بیخودی کی تا لبِ کوثر گئی
کچھ دنوں سے دل میں تھی افسردگی سی چھا گئی   حسن کی شوخی مگر پھر کام اپنا کر گئی
اس مئے مرد آزما کو چاہیے مجھ سا حریف   بس کر اے ساقی کہ اب یاروں کی نیت بھر گئی
حُسن کی شوخی نے شہرت اُن کی پھیلائی اُدھر   میری بیتابی اِدھر بیتاب مجھ کو کر گئی
بادِ مردم سوز تھی جو چلنے والی روزِ حشر   میری تُربت پر وہ آکر ٹھنڈی سانسیں بھر گئی
چھا گیا تھا صبر و خاموشی کا عالم ہر طرف   چال پھر اُس شوخ کی ہنگامہ برپا کر گئی
بڑھ نہیں سکتے فلک جس جا سے آگے اک قدم   میری پروازِ طبیعت اس سے بالاتر گئی
کھیلتا ہے دل مرا دوزخ کے شعلوں سے مدام   دیکھ کر بجلی مری بیتابیوں کو ڈر گئی
حُسن کی دُنیا کی وسعت جو دکھائی عشق نے   کرتے کرتے اُس فضا کو طے تمنا کر گئی
میری ہستی میں نہ حیرت کو ملا میرا پتہ   جستجو کرتی کبھی اندر، کبھی باہر گئی
کارخانہ بجلیاں ڈھلنے کا دیکھا آنکھ سے   جب نگہ میرے دلِ بیتاب کے اندر گئی

دے سکی موجِ تمنا کی روانی کا نہ ساتھ
دوڑنے میں گو مری عُمرِ رواں مر مر گئی

(رسالہ ہمایوں فروری ۱۹۲۶ء۔ جلد ۹۔ نمبر ۲ صفحہ ۱۳۶)

اپنی روٹھی ہوئی قسمت کو مناؤں کیونکر؟

روح سے جسم کے اندر، تجھے لاؤں کیونکر
بھیرویں رمزِ محبت کی سناؤں کیونکر

ہاتھ میں تیرے ہے شبلی کا قلم اے بیباک
میں تجھے نغمۂ منصور سناؤں کیونکر

لن ترانی کی مجھے تاب کہاں اے موسیٰ
نازئیں برقِ تجلی کے اُٹھاؤں کیونکر

ناتوانی ہے مری قطرۂ شبنم سے سوا
اے کرن میں تری آغوش میں آؤں کیونکر

مُردنی تیری امنگوں پہ ہے چھائی غافل!
زندگی کے تجھے اسرار بتاؤں کیونکر

تھا سماں عہدِ جوانی کا بہارِ دل و چشم
ایسے افسانۂ رنگیں کو بھلاؤں کیونکر

سوزِ دل کا نہیں جب ایک شرر بھی مرے پاس
تجھ کو اے خرمنِ پندار جلاؤں کیونکر

فرش پر کونسی راحت نہیں ملتی ناداں!
عرش کے سامنے سر اپنا جھکاؤں کیونکر

ظلمت آبادِ جہاں کھینچ رہا ہے مجھ کو
چھاؤنی انجمِ رخشندہ پہ چھاؤں کیونکر

میری رگ رگ سے نکلتی ہے تجلی کی کرن
میں تجھے پردۂ ہستی میں چھپاؤں کیونکر

میں ہوں آتشکدۂ برقِ تپاں کا شعلہ
اپنی فطرت کی امنگوں کو دباؤں کیونکر

ایک قطرہ ہوں مگر دیر سے اس فکر میں ہوں
کہ سمندر کی فضاؤں میں سماؤں کیونکر

تم خفا ہو تو بتا دے مجھے دنیا میں کوئی
اپنی روٹھی ہوئی قسمت کو مناؤں کیونکر

(رسالہ ہمایوں۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء۔ جلد ۹۔ نمبر ۱۰۔ صفحہ ۷۱۰)

"تم نقاب آ کے اُلٹ دو شبِ تنہائی کا"!

کس قدر تیز ہے جلوہ تری رعنائی کا — چاک ہو جائے گا پردہ مری بینائی کا
میری ہمت کے جو ذرے تھے بکھر کر سمٹے — کیوں نہ ممنون ہوں تری حوصلہ افزائی کا
جو خموشی میں مزا پایا ہے، کیونکر ہو بیاں — ناطقہ بند ہے گویا مری گویائی کا
وہ مئے شوق سما سکتی ہے کس مینا میں — جس سے لبریز ہے دل تیرے تمنائی کا
مرکزِ حسنِ ازل تک ہو رسائی کیونکر — حوصلہ پست ہے تاروں کی توانائی کا
ساقیِ حسن مئے جلوہ ذرا روک کے دے — کہ چھلکنے کو ہے ساغر مری بینائی کا
کروٹیں مُردہ تمنائیں بدلتی ہیں مری — میں ہوں قائل ترے غمزوں کی مسیحائی کا
کان رکھ دل کی طرف غور سے سن اے مظلوم! — کون دیتا ہے یہ پیغام شکیبائی کا
چاندنی رات میں دریا کا وہ لہریں لینا — کھنچ گیا نقشہ تری نازکی انگڑائی کا
"نحن اقرب" ترا اک عشوہ ہے اے حسنِ ازل — کون ہوں میں، کہ ہوں مانع تری یکتائی کا
گوشِ غافل نہیں سنتا ہے تری حمد مگر — شوق ہر چیز کو ہے زمزمہ پیرائی کا
ہر تصور میں ہے پھولوں کی بھری رنگینی، — شوق یہ کس کو ہوا ہے چمن آرائی کا

میری دُنیائے تخیل میں اندھیرا ہے اگر تم نقاب آکے اُلٹ دو شبِ تنہائی کا

ہو نہ گر رنگِ مجازی میں حقیقت کی بہار

پھونک دو لیکے چمن قافیہ پیمائی کا

صفحہ ۳۶

(”علی گڑھ میگزین“. جلد ۳ نمبر ۸ و ۹ ماہ جنوری و فروری ۱۹۲۵ء)

خواب و خیال

(۱)

سنسان پہاڑ کے دامن میں، اک جنگل ہے سرسبز کھڑا
گنجان بھی ہے تاریک بھی ہے، اور وحشت ناک ہے اُس کی فضا

دبکے ہیں درندے جھاڑیوں میں، ہیں سانپ درختوں سے لپٹے
اک دریا جوش و خروش میں ہے بہتا نہ گذرتا جنگل سے

سنگین ہے گھاٹ جو دریا کا، زینہ ہے بلند و وسیع اُس کا
اُس زینہ پہ سنگِ درخشاں کا اِک عالیشان محل ہے کھڑا

دو صدیاں گذری ہیں کہ یہاں، اک شاہ کا گذرا تھا لشکر
شاداں ہوا دیکھ کے دل اُس کا، اِس جنگل و دریا کا منظر

فرمان سے اُس کے بنا یہ محل، جو دامن کوہ میں تاباں ہے
دریا پہ پڑا ہے جو عکس اُس کا، اک نور کا دریا غلطاں ہے

جلسے کئے عیش و تجمل کے، اس شاہ نے ہر گرمی میں یہاں
حوروں کے یہاں پھرتے تھے پرے، چھایا تھا یہاں جنت کا سماں

اب خواب وخیال کے پردے میں، گُم ہو گئے وہ نیرنگِ نظر
خاموش ہے اب جنگل کی فضا، طاری ہے محل پر غم کا اثر

(۲)

تفریح کی نیت کرکے یہاں، آ نکلا قضا را ایک جواں
منظر جو یہاں کا پسند آیا، گرمی میں ہوا خوش باش یہاں
اک شام وہ گھاٹ پہ تھا بیٹھا، جنگل کی فضا کو دیکھ رہا
چھپنے کو تھا سورج مغرب میں، زردائی کا رُخ روشن تھا ہوا
اک چادر زریں نور کی تھی پھیلی ہوئی تختۂ دریا پر
سب فرش محل کا بسنتی تھا، اور گھاٹ تھا گویا تودۂ زر
بو سونف کی اور پودینہ کی، آتی تھی پہاڑ کے دامن سے
اُس پار کنارۂ دریا بھی، آراستہ تھا شگفتہ رَسن سے
چاہا یہ جوان نے کہ گھوڑے پر ہو چڑھ کے ذرا جنگل کو رواں
زینہ پہ یکایک پیروں کی آہٹ سی ہوئی محسوس وہاں
پیچھے کی طرف دیکھا تو اُسے، آیا نہ کوئی انسان نظر
سمجھا کہ یہ ہے خود وہم مرا، جاتا رہا دل سے خوف وخطر

ت بہت سے پروں کی آہٹ سُنی اُس نے کانوں سے
اُنھوں نے مگر پایا خالی، میدان وہاں اِنسانوں سے
دِل خوف سے اُس کا لرزنے لگا، رعشہ سا بدن پہ ہوا طاری
آوازِ قدم کا تسلسل تھا، نزدیک مگر ہر دم جاری
گویا کہ بہت سی پریزادیں، دریا کی طرف آتی ہیں چلی،
آوازیں ہیں اُن کے قدموں کی موسیقی کے سانچوں میں ڈھلی
ہنستی ہوئی چند پریزادیں، پہلو سے جواں کے گزرنے لگیں،
رفتار سے زمزمہ کرتی ہوئی، اس آبِ رواں میں اُترنے لگیں
دریا میں اُترنے سے اُن کے، پانی میں ہوئی جنبش پیدا
پانی کے لگے اُڑنے چھینٹے، چُہلوں کا ہوا طوفاں برپا
دریا میں لگیں جب تیرنے وہ، پانی میں ہوئی ہلچل سی عیاں
دریائے تحیّر میں ڈوبا، تھا دیکھتا یہ ہنگامہ جواں،
تاریک لگی جب ہونے فضا، پانی کو ہوا دریا کے سکوں
دل خوف سے اُس کا دھڑکتا تھا، سر فکر کے عالم میں تھا نگوں

اک رات جواں اُس ہال میں تھا جس کے تھے ستوں گلرنگ حسیں
تھا اپنے نقش و نگار سے وہ ، ہم مرتبۂ فردوسِ بریں
تاریکیٔ شب میں یہ ہال مگر ، آتا تھا سیہ پوش اس کو نظر
یک لخت ہوا کچھ شور عیاں ، بدلا یہ خموشی کا منظر
اس ہال کے اندر حوض جو تھا، فوارے اُس میں اُچھلنے لگے
دھاریں جو ہوئیں پانی کی رواں، دھاروں سے راگ نکلنے لگے
پھر گھنگروؤں کی چھم چھم کی صدا، اس ہال کے فرش پر آنے لگی
یہ ناچ کی دُھن کچھ سازوں کو، بجنے کے لئے اُکسانے لگی
تاروں پہ ہاتھ جو چلنے لگے نغموں کا ہوا ہنگامہ عیاں
اندر کے اکھاڑے کا تھا سماں، پریاں تھیں مگر پردے میں نہاں
اس ہال کے اندر تھی جو ہوا۔ اک بار وہ عطر آمیز ہوئی،
خوشبوؤں سے گلشنِ رضواں کی ، وہ ساری فضا لبریز ہوئی
مستی سے ہوا کی غش کھا کر ، کمرے کی زمیں پہ گرا وہ جواں
جب نیند سے اس کی آنکھ کھلی ، تھا سامنے نورِ سحر کا سماں

(۴)

اک شب کہ تھا گہری نیند میں وہ، آہٹ سے کسی کی چونک پڑا
اک نازک جسم قریب اُس کے، تھا ہاتھوں کو پھیلائے کھڑا
تکیہ سے اُٹھا کر سر اُس نے، چاہا کہ پکڑ لے ہاتھ اُس کے
وہ صورت ہاتھ چھڑا کے چلی، لپکا یہ جواں بھی ساتھ اُس کے
نکلا وہ بہت دروازوں سے، گزرا وہ بہت دالانوں سے
آنکھوں سے نہ کچھ آتا تھا نظر، سنتا تھا صدائیں کانوں سے
شاخوں پہ درختوں کی گویا، خوش لہجہ پرندے چہکتے تھے
کچھ اپنے پروں سے صدا دیتے، لہروں میں ہوا کی لٹکتے تھے
چادر کی اُدھر گرنے کی صدا، آتی تھی پہاڑ کے دامن سے
شیروں کی گرج سنتا تھا ادھر، دریا یہ جو آئے تھے بن سے
ناگاہ وہ پہنچا اک در پر، محراب تھی جس کی قوس نما،
تھا قوس قزح کے رنگوں کا، اک پردۂ رنگیں اُس پہ پڑا
پردہ کے قریں ٹھیری وہ پری، تھا سایہ پہ جس کے، وان جواں
اک خواجہ سرا تلوار لئے، اُس در پہ نظر آیا درباں
کھینچا جو پری نے پردۂ در، اندر کا سماں تھا پیش نظر

اِک فرش تھا واں گلکار بچھا، تھے سطح پہ جس کی ٹکے گوہر
اِک تخت جواہر بیچ میں تھا، تھی جس پہ پری اک جلوہ نما
کرتی تھی تبسّم جب وہ ذرا، کمرے میں ٹپکتا نور سا تھا
پوشاک تھی رنگا رنگ اُس کی، زیور سے لدا تھا اُس کا بدن
گویا کہ نگاہِ تخیّل میں تھا جلوہ نما جنّت کا چمن
اُلفت نے سے بڑھایا ہاتھ اُس نے، بوسہ کے لئے لپکا یہ جوان
نرم انگلیاں جب ہونٹوں سے ملیں، اک بار ہوئی جاں تن بےجان
تا وقتِ سحر غش اُس کو رہا، چڑیوں کی صدا سے ہوش آیا
اِک نورِ ظہور کا عالم تھا، دریا کے کناروں پر چھایا

(۵)

القصّہ محل کی راتیں تھیں یا سحر بھرے تھے افسانے
کمرے جو محل کے اندر تھے، گویا کہ وہ سب تھے پریخانے
آتے تھے ہوا کے اگر جھونکے، خوشبوؤں سے گویا تھے لدے
کھل جاتے تھے اِک دم کے لئے، کمرہ میں ہزاروں عطر کدے
چھڑتے تھے ہزاروں ساز کبھی نغموں کی صدائیں آتی تھیں

پریاں تھیں ہزار وں حُسن بھری، جو ناچتی تھیں اور گاتی تھیں
پڑتے تھے کبھی دیواروں پر، نورانی عکس حسینوں کے
گلبازی میں مشغول کبھی تھے، طائفے ماہ جبینوں کے
مرغان چمن کے چہچہے تھے، آتے تھے جو ہل کے ہواؤں میں
کچھ کبک دری کے قہقہے تھے، ہوتے تھے بلند فضاؤں میں
کچھ روشنیاں تھیں جو رہ رہ کر، کمروں میں محل کے چمکتی تھیں
کچھ راگنیاں تھیں جو تھم تھم کر، کانوں کی سمت لپکتی تھیں
تھے چھت سے برستے پھول کبھی، موتی کبھی فرش پہ تھے غلطاں
تھے مے کے چھلکتے جام کبھی، ہوتے تھے چراغ کبھی تاباں،
پڑتی تھی پھوار محل پہ کبھی، آتی تھی ہوائے سرد کبھی
جو پھول تھے واں گلدانوں میں، تھے سرخ کبھی اور زرد کبھی
ہوتی تھی جو شام تو دریا پر، تھے ٹوٹتے گردوں سے تارے
جب بھیگتی رات تو ساحل پر، تھے لوٹتے پھرتے انگارے
منظر جو عجیب و مہیب ہوئے، ہر رات جواں کی پیش نظر
پہلے تو ہوا کچھ خوف اُسے، پھر رہ گیا حیرت سے ششدر

مبہوت ہوا دیوانہ ہوا، یاروں کو ہوئی جب اُس کے خبر
فصاد کو آئے لیکے وہاں، تھا ہاتھ میں اُس کے اک نشتر
وہ خواب و خیال کا دریا بھی بہتے ہوئے خوں کے ساتھ بہا
آیا نہ اُسے پھر کچھ بھی نظر، جب تک کہ وہاں وہ ٹھیرا رہا

("علی گڈھ میگزین" جلد ۳ نمبر ۱۱-۱۲- بابت ماہ مئی و جون ۱۹۲۵ء ص ۱۳)

نظرِ ثانی

پھر نظر آنے لگی جلووں کی طغیانی مجھے
خاک میں لے جائے گا یہ موجزن پانی مجھے

وجد کرتے ہیں مرے نغموں کو سنکر اہلِ خلد
کیا لبھائے گی پرندوں کی خوش الحانی مجھے

شہپرِ ادراک رہ جاتے ہیں جہاں پرواز سے
اس فضا میں آج دکھلاتی ہے جولانی مجھے

نردبانِ سعی سے تھا عرش پر اپنا خرام
پر زمیں میں لے گیا ذوقِ تن آسانی مجھے

کر کے دانائی کا دعویٰ ایسا میں کھویا گیا
ڈھونڈتی پھرتی ہے ہر سو میری نادانی مجھے

حُسن ہو جس جا بھی ہو، ہو منتظم یا منتشر
کیا بھلی لگتی ہے تاروں کی پریشانی مجھے

بوئے گل بنکر نکل جاؤں گا قیدِ رنگ سے
تو نے عاجز کر دیا اے دردِ عُریانی مجھے

بزمِ چشمِ رنگ کی وسعت میں جو آتا نہ ہو
اس بتِ نیرنگ کی کرنی ہے مہمانی مجھے

چین سے تو بھی نہ بیٹھے گا زمانہ میں کبھی
خاک کر ڈالا۔ ارے او سوزِ پنہانی مجھے

لامکاں میں شوقِ عریانی کی دلچسپ سیر
یوں مکاں سے لے اڑا ہے ذوقِ عریانی مجھے

بزمِ لاہوتی، شناساؤں کی تھی اک انجمن
سب نظر آئیں نگاہیں جانی پہچانی مجھے

نقشِ حیرت بن گیا نقشِ کفِ پا دیکھ کر
آگے بڑھ کر کیا دکھائی ہے یہ حیرانی مجھے

معرفت کا درس لینا ہے انھیں سے قلبِ زار
ہستیاں جن کی نظر آتی ہیں نورانی مجھے

جبہہ سائی غیر کے در پر نہ زیبا تھی سلیم
آستانِ دل پہ رکھنی تھی یہ پیشانی مجھے

(”علی گڑھ میگزین“ جلد ۳ نمبر ۷ بابت دسمبر ۱۹۲۴ء صفحہ ۷)

جَادۂ ترقّی

مثلِ پروانہ تم اِک پل میں نہ جلنا سیکھو
تاسحر شمع کی مانند پگھلنا سیکھو

دل کو کرنا ہے اگر سوزِ محبت میں کباب
کروٹیں آگ کے بستر پہ بدلنا سیکھو

زندگی نام ہے حرکت کا، تم افسردہ نہ ہو
نبض کے خون کی مانند اُچھلنا سیکھو

عزم جو دل میں ہو، پورا اُسے تم کرکے رہو
طفلِ سرکش بنو، اور ضد سے مچلنا سیکھو

چشمۂ آب ہو تم سوتے ہو کیوں زیرِ زمیں؟
سنگِ خارا کے شگافوں سے اُبلنا سیکھو

نہ ڈرو صدمۂ طوفان سے، مانندِ نہنگ
ورطۂ بحر کی آغوش میں پلنا سیکھو

آنچ سے رنج و مصیبت کی نہ کچھ خوف کرو
موم کی طرح ہر اِک سانچے میں ڈھلنا سیکھو

ہے کٹھن منزلِ تسلیم تو پروا کیا ہے
سر کے بل دھار پہ تلوار کی چلنا سیکھو

کلفتِ دہر سے کیوں ناک چڑھاتے ہو ابھی
اس مئے تلخ کے دو گھونٹ نگلنا سیکھو

ہو کے پامالِ حوادث، نہ ترقی سے رُکو
دُوب کی طرح سے دب دب کے نکلنا سیکھو

"ہزاروں رنگ ہوتے ہیں ترے نیرنگ سے پیدا"

ہوئے دل سے مرے جذباتِ عشق اس رنگ سے پیدا
شرارے جس طرح ہوتے ہیں قلبِ سنگ سے پیدا

مٹا دو اپنی ہستی کو، اگر شہرت کے طالب ہو
نہ نام و ننگ ہو گا فکرِ نام و ننگ سے پیدا

جوانی چھائی جاتی ہے ترے رُخ پر عجب کیا ہے
ہزاروں حُسن کے کشمیر ہوں اس رنگ سے پیدا

سکھائی فصلِ گل کو تو نے عجب طرزِ خود آرائی
نئے جلوے ہوئے گلہائے رنگا رنگ سے پیدا

حسینوں کے مُرقع میں جو کی قدرت نے گلکاری
نہ ہوں گی صورتیں یہ خامۂ ارژنگ سے پیدا

عجب کیا کھینچ لے اپنی طرف جنت پرستوں کو
کہ ہلکورے ہیں کوثر کے مئے گلرنگ سے پیدا

چلو اے میکشو! گلزار میں جام و سبو لے کر
کہ آثار ابر کے ہیں چرخِ مینا رنگ سے پیدا

کہیں ہیں بے کفن لاشے کہیں ہیں خون کے چھینٹے
نشاں ہیں کوئے قاتل کے کئی فرسنگ سے پیدا

سکھاتا کون ہے یہ شعبدے اے آسماں تجھ کو
ہزاروں رنگ ہوتے ہیں ترے نیرنگ سے پیدا

مکان و لامکاں دونوں سمائے جن کی وسعت میں
فضائیں تو نے کیں وہ میرے قلبِ تنگ سے پیدا

عجب کیا طوس[1] کی بلبل ہو آ کر نغمہ خواں ان پر
ہوئے ہیں پھول خاکِ ہمن و ہوشنگ سے پیدا

---

[1] فردوسی کی طرف اشارہ ہے۔

حزیں[1] کی روح کو ہیں عالم برزخ میں تڑپاتے ... وہ جلوے ہو چکے ہیں جو کنار گنگ سے پیدا

پس پردہ مغنی ازل کو میں نے پہچانا ... صدائیں کچھ ہوئیں ایسی رباب چنگ سے پیدا

دیئے ہیں تجھ کو قدرت نے وہ مضمون آبدار اے دل

صدف میں بھی نہ ہوں موتی اس آب و رنگ سے پیدا

(”علی گڈھ میگزین“ جلد ۳۔ نمبر ۶ ۔ بابت اکتوبر و نومبر ۱۹۲۴ء صفحہ ۱۰۱)

---

[1] حزیں کے ایک مشہور شعر کی طرف اشارہ ہے، جو بنارس میں اُس کی قبر پر لکھا ہوا ہے۔

"مدت ہوئی ہے مدح حسیناں کئے ہوئے"

مدت ہوئی ہے مدح حسیناں کئے ہوئے
نورِ سخن سے دل کو چراغاں کئے ہوئے

عرصہ ہوا ہے وصفِ بہارِ جمال سے
روئے ورق کو رشکِ گلستاں کئے ہوئے

برسوں ہوئے ہیں تذکرۂ سوزِ عشق سے
بزمِ سخنوری کو درخشاں کئے ہوئے

آتا ہے کس شکوہ سے وہ رشکِ آفتاب
ظلمت کدے دلوں کے چراغاں کئے ہوئے

جاتا ہوں کوئے یار سے دیکھ اے گھٹا مجھے
برپا ہجومِ اشک سے طوفاں کئے ہوئے

بیٹھا تھا رات میں بھی کسی جلوہ گاہ میں
ہر دیدۂ مسام کو حیراں کئے ہوئے

کرتا تھا رات وہ مرے دل کا مطالعہ
شیرازۂ وفا کو پریشاں کئے ہوئے

بیٹھے ہیں ہم تصورِ گیسوئے یار میں
اس زندگی کو خوابِ پریشاں کئے ہوئے

خوں کر کے لے چلا ہوں دلِ چاک کو اپنے ساتھ
دیدارِ روئے یار کا ساماں کئے ہوئے

اشکوں کو میرے چشمِ حقارت سے تو نہ دیکھ
پنہاں یہ آستیں میں ہیں طوفاں کئے ہوئے

مر مٹنے اس ادا پہ کہ کچھ لوگ جل بجھے
سینہ میں سوزِ عشق کو پنہاں کئے ہوئے

کرلو زیارت ان کی کہ یہ زاہدانِ خشک
آبادیاں ہیں حسن کی ویراں کئے ہوئے

سُن نغمہ گوشِ ہوش سے گذرے جو بادِ صبح
تارِ شعاعِ مہر کو لرزاں کئے ہوئے

کس حُسنِ دلفریب کا ہے یہ نشہ کہ ہے
عالم کے ذرہ ذرہ کو رقصاں کئے ہوئے

ہے کون شہسوار کہ چوگانِ نور سے
لاتا ہے گوئے مہر کو غلطاں کئے ہوئے

بجلی کی طرح وہ مرے دل سے گذر گیا
اپنے سمندِ ناز کو جولاں کئے ہوئے

سچ مانئے کہ یہ سروساماں کا ہے خیال
یاروں کو ہے جو بے سروساماں کئے ہوئے

کیا لوگ ہیں جو ہیں درِ دلدار پر پڑے
حرماں کو اپنے درد کا درماں کئے ہوئے

کیا لوگ ہیں وہ جنکی جبیں پر شکن نہیں
اور دل میں حسرتوں کو ہیں پنہاں کئے ہوئے

تلواریں کھا کے ہنستے ہیں وہ حق پرست جو
ہیں دل کو مستِ جلوۂ ایماں کئے ہوئے

وہ نوبہارِ حسن ابھی اس راہ سے گیا
ہر نقشِ پا کو روضۂ رضواں کئے ہوئے

اعجازِ عشق کا ہے کہ ہے اس جہاں میں وہ
لب تشنگی کو چشمۂ حیواں کئے ہوئے

دے سر جھکا کے تسلیم کہ وہ نوبہارِ حسن
آتا ہے تیغِ ناز کو عریاں کئے ہوئے

"اودھ اخبار" ۲۹ جولائی ۱۹۲۳ء

جُزاورکُل

اگر تو غور سے دیکھے تو جُز میں کُل کا نقشہ ہے
بغل میں ذرّہ کی تصویر ہے مہرِ درخشاں کی

جدھر تو جھانکتا روزن سے ہے لے حسن کے پتلے
شعاعیں ٹوٹ پڑتی ہیں ادھر مہرِ درخشاں کی

نہ کیوں رشک آئے قسمت پر تری اے قطرۂ شبنم
کرے اٹھکھیلیاں تجھ سے کرن مہرِ درخشاں کی

میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ مجھکو غنچہ و گل میں
تجلی ڈھونڈتی پھرتی ہے خورشیدِ درخشاں کی

حجابِ قدس میں تاروں کی آنکھوں سے وہ پنہاں تھا
سحر نے کھینچ دی تصویر اُس کے حسنِ عریاں کی

(اودھ اخبار ۲۹ جولائی ۱۹۲۵ء)

رازِ ونیاز

جب نہ پایا کسی ہستی کو مقابل تُو نے — اپنی شوخی کو کیا آپ ہی بسمل تو نے
طور کو پایا نہ جس نُور کے قابل تُو نے — روشن اُس سے کیا ناگاہ مرا دل تو نے
مہرِ عارض ترا پردے میں نہاں ہو لیکن — ذرّہ ذرّہ کو کیا رقص پہ مائل تو نے
خاکِ مجنوں کے ہر اک ذرّہ کی ہے آنکھ کھُلی — کہ اُٹھایا تھا کبھی پردۂ محمل تو نے
قافلے حُسن کے آگے سے گزرتے ہیں ترے — آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا کبھی غافل تو نے

وسعتِ کون و مکاں جس کے ہر اِک گوشہ میں ہے
میرے پہلو میں ودیعت کیا وہ دِل تو نے

("اودھ اخبار" ۳۔ اگست ۱۹۲۵ء)

زندگی

ذرے ذرے میں دواں رُوحِ رواں پاتا ہوں مَیں
زندگی کو ایک بحرِ بے کراں پاتا ہوں مَیں

غنچہ غنچہ نطق پر آمادہ آتا ہے نظر
پتے پتے کی زباں کو نغمہ خواں پاتا ہوں مَیں

زندہ ہستی کی خبر دیتی ہے رفتارِ نفس
بُوئے گل کو زندگی کا ترجماں پاتا ہوں مَیں

برق کی جنبش ہو، یا بادِ صبا کا ہو خرام
زندگی کا ہر تموج میں نشاں پاتا ہوں مَیں

چپہ چپہ اس مکاں کا ہے مکینوں سے بھرا
زندگی کو شش جہت میں حکمراں پاتا ہوں مَیں

اِس سے آگے بھی ہیں روحیں اُڑتی پھرتی بے شمار
طائرِ سدرہ کا جس جا آشیاں پاتا ہوں مَیں

ہو چکی ہے حکمراں جس نخل پر بادِ خزاں

اس کی رگ رگ میں بہارِ بےخزاں پاتا ہوں میں

چارسو راہِ سفر پر دوڑتی ہے جب نظر

زندگی کو کارواں در کارواں پاتا ہوں میں

جانے والوں کی تباہی کے نشانوں میں نہاں

آنے والی ہستیوں کی بستیاں پاتا ہوں میں

الغرض سمجھے ہو جن کو موت کی بربادیاں

زندگی کے انقلاب اُن میں نہاں پاتا ہوں میں

(رسالہ "ہمایوں" دسمبر ۱۹۲۷ء جلد ۱۲ نمبر ۶۔ بحوالہ رسالہ "اردو"۔)

"حیرت نہیں۔ گر خضر کے یاں پاؤں رپٹ جائیں"

سر کاش! تصور سے ترے غیر کے ہٹ جائیں
دل کاش! ترے حسن کے جلووں ہی سے پٹ جائیں

دنیا میں ہوا ولولۂ دید کی ہے تیز
اے عالم فطرت! ترے پردے نہ الٹ جائیں

افسردہ ارادے تری مٹھی میں ہیں اے دل!
یہ تیر تو وہ ہیں جو نشانے سے اچٹ جائیں

ہیں اہل ہوس میکدۂ عشق میں جہاں
کیا دور ہے، گر ایک ہی چلو میں الٹ جائیں

کر دیں گے عیاں وہ مری بیتابیٔ دل کو
گر چند ترا رے کبھی پتھر سے اچٹ جائیں

اے عشق! تری شوخیاں اب حد سے سوا ہیں
خطرہ ہے کہیں حسن کے تیور نہ پلٹ جائیں

کیا کیا ہے تعصب کی ہوا خاک اڑاتی
اس گرد سے روزن کہیں سینوں کے نہ اٹ جائیں

تیری نظر لطف پہ بنیاد جہاں ہے
برپا ہو قیامت، ترے تیور جو پلٹ جائیں

جو زہد کی خلوت میں دل افسردہ ہیں بیٹھے
اے کاش! جوانوں کی امنگیں انھیں پٹ جائیں

اے کاش! ہو وہ جلوۂ بے رنگ نمایاں
یہ رنگ کے بادل ہیں جو چھائے ہوئے پھٹ جائیں

رنگینیاں دکھلائیں تری مدح میں گر ہم
بازار جہاں نظم کے پھولوں سے وہ پٹ جائیں

یوں عقل پہ ہوتے ہیں مری نفس کے حملے
جس طرح کہ چیتے کسی آہو پہ جھپٹ جائیں

ہستی مری آہن ہے، وجود اس کا ہے پارس
ذرے مری ہستی کے یہ کاش اس سے چمٹ جائیں

احساں نہ اٹھاؤں گا کسی ابرِ کرم کا، | گو باغِ تمنا میں جو بوٹے ہیں وہ چھٹ جائیں
کس کام کی لے دل! وہ ترقی کی امنگیں؟ | ہر دم صفِ انجم سے جو ٹکرا کے پلٹ جائیں
منزل ہے کٹھن "راہِ فنا" کہتے ہیں جس کو | حیرت نہیں گر خضر کے یاں پاؤں اُکھڑ جائیں
تم ہاتھ نہ پھیلاؤ کہ شومی سے تمھاری | ایسا نہ ہو، دُنیا کے خزانے بھی سمٹ جائیں
ایامِ سفر عیش میں کٹتے رہے جن کے | ممکن ہے کہ وہ قافلے رستے ہی میں رک جائیں
حق گو ہے اگر تو، تو نہ جھوٹوں سے خطر کر | کیا دُور، تری سیفِ زبانی سے وہ کٹ جائیں
بلبل جو اُڑاتی ہے دُھواں سوزِ جگر سے | اندیشہ ہے پھولوں کے کہیں رنگ نہ کٹ جائیں
کمزوروں پہ جو دستِ ستم اپنا بڑھائیں | کیا دور ہے، زور اُن کی جوانی کے بھی گھٹ جائیں
انگشت نما ہونے سے یوں جاتی ہے رونق | انگلی سے گلستاں کے ورق جیسے اُلٹ جائیں
تم اور قیامت کا نہ دکھلاؤ تماشا | فتنے نہ کہیں آن کے دامن سے لپٹ جائیں
ہمت نہیں چلنے کی جنھیں راہِ طلب میں | وہ خاک سے بس نقشِ قدم بن کے چمٹ جائیں
چاہو تو دبا سکتے ہو جذبات کو دل میں | یہ وہ ہیں سمندر کہ جو کوزہ میں سمٹ جائیں
زنہار نہ ملاح سے امداد طلب کر | طوفاں بھی گر آ کر تری کشتی سے لپٹ جائیں
رکھ نفس کے جذبوں سے سلیم آپ کو محفوظ | یہ سانپ ہیں وہ، کاٹ کے جو تم میں الٹ جائیں

("علی گڑھ میگزین" جلد ۲ نمبر ۱۲ - دسمبر ۱۹۲۳ء صفحہ ۷۴-۷۵)

"نہاں ہفت آسماں ہیں میری گردِ خاکساری میں"

یہ کس رشکِ چمن کی شوخیوں کا ہے اثر یارب!
کہ مثلِ نبضِ بسمل ہے تڑپ بادِ بہاری میں

شرابِ لالہ گوں سے جام ٹکرا کر ہوئے اُلٹے
دکھائی آنکھ جب ساقی نے بزمِ بادہ خواری میں

فضا میں اب غبار اُن کا نظر آتا نہیں اُڑتا
ہوئے پامال کشور جن کی مشقِ شہسواری میں

اِدھر کرتی ہے حسن آرائیاں بادِ سحر گُل کی
اُدھر شبنم کے قطرے محو ہیں آئینہ داری میں

ہوئی جب صبح عکس اُس کا دکھایا مہرِ انور نے
نگاہیں ڈھونڈتی تھیں شب جسے اختر شماری میں

نہ تو اے شہسوارِ ناز ٹھکرا میری تربت کو
نہاں ہفت آسماں ہیں میری گردِ خاکساری میں

(اودھ اخبار" ۵۔ اگست ۱۹۲۵ء)

سنبھل جا!

غفلت کی بیخودی یہ کب تک رہیگی اے دل
سَو بار گر چکا ہے، اِک بار تو سنبھل جا

چہرے پہ مُردنی سی چھائی رہے گی کب تک؟
اُٹھ! اور زندگی کے سانچے میں اُٹھ کے ڈھل جا

دیکھیں تو، زندہ کیونکر رہتا نہیں تو اے دل!
میری سُنے تو ناداں! مرنے ہی پر مچل جا

ایسی حیات شیریں سب کو نہیں میسّر
دُنیا کی تلخیوں کے گھونٹ ایک دم نگل جا

(رسالہ "شمع" آگرہ۔ بابت اپریل ۱۹۲۶ء جلد ۳ نمبر ۴۔ صفحہ ۴۶)

قدرت کے تیور

کشتیاں قوم کی قسمت کی اُلٹتی ہیں وہیں
اِک تلاطم ہے جہاں عیش کے سامانوں کا
موشگافی ہے نظر میں تو ذرا غور سے دیکھ
ریشہ نَے میں ہے انبوہ نیستانوں کا
میری کشتی گئی گرداب سے بچ بچ کے نکل
دیکھنا ہے ابھی تیور مجھے طوفانوں کا
ملگجا رنگ جو غفلت نے ہے منہ پر پھیرا
یہی دیباچہ ہے ادبار کے افسانوں کا
بزمِ گردوں میں ستاروں پہ نظر کر غافل!
کوئی ساقی بھی ہے اِن نور کے پیمانوں کا؟
آنچ آئے گی ترے در کے گدا پر نہ کبھی
طنطنہ خاک میں مل جائے گا سلطانوں کا

(رسالہ شمع آگرہ۔ اپریل ۱۹۲۶ء۔ جلد ۳۔ نمبر ۴۔ صفحہ ۲۵)

شبِ قدر

میں نے کل شب درِ دل کی جو ہلائی زنجیر
آیا اندر سے نکل ایک بُتِ ہوش رُبا

سر مرا ساتھ فرشتوں کے جُھکا سجدے میں
آئی اُس بُت میں نظر مجھ کو تجلّی خدا

یہ شبِ قدر تھی کس پردہ میں پنہاں اب تک
عقل حیرت میں ہے میری کہ یہ اسرار ہے کیا،

کون میں ہوں کہ دردل پہ ہوں دیتا دستک
کون ہے وہ کہ مرے دل میں ہے چھپکر بیٹھا

میں اگر میں ہوں تو ہوں میں تو سراپا ظلمت
مجھکو اُس ہوش رُبا نور سے پھر واسطہ کیا،

وہ اگر وہ ہے تو پھر وہ تو ہے اک برقِ جمال
تاب لاسکتی نہیں جس کی یہ آنکھیں اصلا

("وکٹوریا گزٹ")

جولانیاں

افلاک نے کھولی ہیں جو تیغیں کمروں سے — جو تاج سروں سے ہیں ستاروں نے اتارے
قصّے تجھے میں اُن کے سناؤں گا جگر دوز — دکھلاؤں گا میں تجھکو یہ عبرت کے نظارے
معلوم ہیں اسرارِ طبیعت سے مجھے اکثر — انداز زمانے کے مجھے یاد ہیں سارے
ہے شرط مگر یہ کہ مجھے دے وہ مئے ناب — جو میری طبیعت کو اشاروں میں اُبھارے
آنے دے بلندی پہ مری طبع رسا کو — لاؤں گا ابھی توڑ کے میں عرش سے تارے
ہونے دے روانی مری تقریر میں پیدا — بھرنے دے مری خاطرِ روشن کو طرارے
دے جام میں بھر کر مجھے وہ آتشِ سیال — جس سے کہ لگیں جھڑنے مرے مُنہ سے شرارے
گرمائے گی جب میری طبیعت تو کرے گی — قدرت کے اسرار کشائی کے اشارے
کھینچے گی وہ افلاک کی گردش کا مُرقع — پھرتے ہوئے آئیں گے نظر اُن میں ستارے
اقوام کی تاریخ کے اُلٹے گی وہ دفتر — مُلکوں کے تغیر کے دِکھائے گی نظارے
تفصیل پھر اسباب و نتائج کی کرے گی — زنجیر کے حلقے نظر آجائیں گے سارے
لا کشتیِ صہبا کہ تجھے ساقیِ فیاض! — آجائیں نظر بحرِ طبیعت کے کنارے

("وکٹوریا گزٹ")

متفرّقات

پیام کس کا لائی تھی یا رب! نسیمِ صبح
جو گُل چمن میں تھا ہمہ تن چشم و گوش تھا

پرتو پڑا جو حُسن کا چشمِ خیال پر
عالم تمام اِک سبدِ گُل فروش تھا

صبحِ ازل کی پہلی کرن کا تھا یہ اثر
ہستی کا ذرّہ ذرّہ تبسّم فروش تھا

تاروں کو اس کے تیرے اشاروں نے دی کمک
ورنہ یہ سازِ ہستیِ انساں خموش تھا

پہلو میں ہے ترے وہ جسے ڈھونڈتا ہے تو
منزل میں بیٹھا پاؤں اگر لنگ ہے ترا

ذرا اپنے دل کا کھول کے دیکھ اس کی وسعتیں
دُنیا کی اِس فضا سے جو دل تنگ ہے ترا

ازراہِ طنز کہتے ہیں اہلِ سُخن سلیم
دہلی و لکھنؤ سے جدا رنگ ہے ترا

بِکس رہی ہیں چمن میں کلیاں، لرز رہے ہیں فلک پہ تارے

کسی نے دیکھا نہ تھا ابھی تک یہ جلوۂ بے نقاب تیرا

نہ میری کشتی کو چھو سکے گا، یہ تیرے قہر و غضب کا طوفاں

کہو سمندر کی موج سے تم عبث ہے یہ اِضطراب تیرا

بہشت دیدار کا پتہ دے، اگرچہ دوزخ سے ہو گذرنا

رہے مبارک یہ تجھ کو واعظ! عذاب تیرا۔ ثواب تیرا

میری قسمت کے جو ذرے تھے بکھر کر سمٹے
کیوں نہ ممنوں ہوں تری حوصلہ افزائی کا

تیتلیاں اڑ گئیں انجام کو پریاں بن کر
شوق فطرت کو ہے از بس کہ خود آرائی کا

زندریزوں[1] کا جو ہے خون کے قطروں میں ہجوم
اک نمونہ ہے تری انجمن آرائی کا

(رسالہ شمع آگرہ ۔ اپریل ۱۹۲۶ء)

عشق و انساں میں ہے جو ربط نہ مجھ سے پوچھو
مشتِ خس پر ہے یہ اک شعلہ کا لرزاں ہونا

حسن کامل ہو تو ہے آج بھی ممکن غافل!
پارۂ سنگ کا پھر لعل بدخشاں ہونا

بعدِ مردن جو کھلی آنکھ۔ تو معلوم ہوا
ساری بیداری کا اک خوابِ پریشاں ہونا

قابلیت ہو تو فطرت کو ذرا بخل نہیں
ایک ریشہ سے بھی ممکن ہے نیستاں ہونا

افسردگی ہے انجمنِ گل پہ چھا رہی
اے عندلیب! تیری فصاحت کو کیا ہوا

غنچے ہیں محو خوابِ تغافل میں اب تلک
اے بادِ صبح تیری لطافت کو کیا ہوا

اب کوئی کان لعل اگلتی نہیں کبھی
اے آفتاب تیری حرارت کو کیا ہوا

کیوں سبزہ زار کا نظر آتا نہیں سماں
اے ابر تیرے جوشِ طراوت کو کیا ہوا

آوارہ دشتِ عشق میں ہیں طالبانِ راہ
اے خضر تیرے فرضِ ہدایت کو کیا ہوا

کیسی چہل پہل میں ہیں رہتے وطن فروش
اے جذبۂ وطن تری غیرت کو کیا ہوا

(وکٹوریہ گزٹ)

[1] وہ ننھے ننھے کیڑے جو خوردبین کی مدد سے دکھائی دیتے ہیں۔ آنکھ سے نظر نہیں آتے۔

دل میں جب آیا تصور اُس بہارِ حُسن کا — آرزوئیں جتنی تھیں، سب گُل بداماں ہو گئیں
اُس طرف اُلٹا نقاب اور خلد کا در کھُل گیا — اِس طرف پلکیں اُٹھیں اور گُل بداماں ہو گئیں
قابلِ دید اُس کے تیور تھے سوالِ وصل پر — بجلیاں چمکیں، نگاہیں تیغِ عُریاں ہو گئیں

سنبھل اے شہسوارِ عرصۂ جذباتِ نفسانی
جما آسن کو اور قابو میں لا بجلی کے توسن کو
مدد اے ذوقِ ویرانی! کہ آبادی سے وحشت ہے
نہاں ہر دانۂ خرمن میں کر دے برقِ خرمن کو
جگر ہو ہو کے ٹکڑے، ہر نفس کے ساتھ آتا ہے
کوئی سیکھے گا کیا مجھ سے مرے اندازِ شیون کو
نہ ہو وہ غیرتِ گلشن، تو پھر سیرِ چمن کیسی
وہ گُل چیں ہوں کہ چٹکی میں مَسل دوں سارے گلشن کو

(اودھ پنچ، ۱۵ جنوری ۱۹۲۶ء)

ایک دانہ بھی مرے خرمن کا جل سکتا نہ تھا — صاعقے بربادیوں کے تلملا کر رہ گئے
رزمگاہِ زندگی کرتی تھی مردوں کو تلاش — ہمتیں کچّی تھیں جن کی ہچکچا کر رہ گئے
عقلِ انسانی نہ سمجھی آج تک رمزِ حیات — عالمِ فطرت کے جلوے مُسکرا کر رہ گئے

ترقی کی اُمنگوں سے پر پرواز پیدا کر — وگرنہ چھو نہیں سکتا تو ہرگز بامِ شہرت کو

(”ہمایوں“ مارچ ۱۹۲۸ء)

مرے تہبیر کے سایہ میں ہے سارا عالمِ امکاں
اگر دیکھوں ذرا پھیلا کے میں بازوئے ہمت کو

طوفانِ حوادث سے، لڑ سینہ سپر ہو کر
آتی ہیں یہ آوازیں پیہم لبِ دریا سے

چٹکنا بھی تجھے مشکل ہے غنچہ کی طرح غافل!
گلستاں کی فضا لبریز ہے شورِ رعنا دل سے

ہر ایک سطرِ نفس میں غافل! ہزاروں اسرار جلوہ گر ہیں
ورق ورق کھول کر نہ دیکھی یہ زندگی کی کتاب تو نے

(نگار - سالنامہ ۱۹۳۲ء)

جو پست عقل ہیں، وہی رکھتے ہیں آرزو
آرام و عیش کی فلک کج خرام سے

تیرا یہی گناہ ہے کافی کہ اے تسکیم!
باتیں تری بلند ہیں عقلِ عوام سے

ولولہ عام ترقی کا زمانہ میں ہے آج
ہر فرو تر کی یہ خواہش ہے کہ برتر بن جائے

ذرہ کہتا ہے کہ میں بن کے رہوں گا خورشید
قطرہ کے دل میں ٹھنی ہے کہ سمندر بن جائے

عشق نے پھونکا تھا پہلے میرے دل کو اے تسکیم!
رفتہ رفتہ آگ یہ تن میں سرایت کر گئی

(ماہِ نو کراچی ۵۹ء)

صبحِ خنداں کا کبھی دیکھا نہ تھا ایسا شباب
شاہدِ قدرت نے گویا آج الٹ دی ہو نقاب

بامِ عظمت پر ترے چمکی جو اک برقِ طپاں
بال و پرِ مرغِ تخیل کے بھی جل کر رہ گئے

اُمنگوں نے کیا ہے زندگی کو میری طولانی
نہ پہلو میں یہ دل ہوتا، تو قصہ مختصر ہوتا

زندگی اُس میں کہاں جس میں ہو یہ صبر و سکوں
تو بھی دکھلا موج کے مانند اے ساحل تڑپ

زندگی کی ہے ترے دم سے جہاں میں ہل چل
کہتے ہیں تجھ کو جہاں کی رگِ جاں اے ہمت

اے زندگی! آخر نہیں تیری تگ و دو کا
جس طرح کہ رہتی ہے سدا گرمِ سفر موج

زندگی چاہے تو پھر خضر کا احساں نہ اُٹھا
آبرو چاہے تو لے چشمہ حیواں سے بگاڑ

دل میں انسان کے گرہو تو حقیقت کھل جائے
یہی جھلکی سی جو پوشیدہ ہے پروانے میں

تاکہ باقی نہ رہے ہستی و مستی میں تمیز
بھر دو جذبات کی مے عمر کے پیمانے میں

جو زہد کی خلوت میں دل افسردہ ہیں بیٹھے
اے کاش جوانوں کی ترنگیں انھیں مل جائیں

خوشی کو کیوں رنج و غم سے بدلو، بہار کو کیوں خزاں بناؤ
کلی کھلی ہو اگر نہ دل کی، نہ جاؤ پھولوں کی انجمن میں

(ہمایوں، مئی ۱۹۲۶ء)

زندگی کا بھی سمندر ہے عجب عربدہ خیز! — جس و حرکت کے بھنور پڑتے ہیں جا نداروں میں

عمر بھر کی ہیں وفاؤں پہ وفائیں میں نے — گرچہ جھیلی ہیں جفاؤں پہ جفائیں میں نے
وہ تمنائیں کہ سینے میں پلیں ناز کے ساتھ — اُن کی جلتی ہوئی دیکھی ہیں چتائیں میں نے

مجھ سے ہر دم شاہدِ قدرت یہ کرتا ہے خطاب — کھول دے چشمِ بصیرت تو جو آ کر ہوش میں
حسن و عظمت کی کوئی دُنیا نہیں ایسی سلیم! — جو سما سکتی نہ ہو اس وسعتِ آغوش میں

زمزمے سن کر مرے حمدِ الٰہی میں سلیم — طائرانِ عرش بھی محوِ ترنم رہ گئے

جو کر چکی ہیں تری خاکِ در پہ سجدۂ شوق، — نکلتی نور کی دھاریں ہیں اُن جبینوں سے
نحوست اور سعادت ہے کیوں نصیبوں میں — یہ حرفِ راز نہ روشن ہوا جبینوں سے

دیکھی ہیں جھلکیاں ترے حسنِ غیور کی، — تھرّائے کیوں نہ خوف سے لَو شمعِ طور کی
آنکھیں کھلی ہیں سب کی جو حیرت سے چار سُو — آئینہ بندیاں ہیں یہ بزمِ حضور کی

کون ہے جو ہے خرام آموزِ امواجِ نسیم — کون ہے مشاطۂ حسنِ عروسانِ چمن

ذرہ ذرہ کو ہے یاں ذوقِ تبسم غافلو! — دیکھ کر قدرت تمہیں افسردہ حیراں کیوں نہ ہو

دیدۂ بیدار ئیں انجم سے لے کر مستعار — دیکھتا ہوں شاہدِ قدرت کی بزم آرائیاں

کیوں ترے جذبات میں ہوتی نہیں ہلچل سلیم! — دیکھ کر ہنگامۂ عالم جو تو خاموش ہے

غافل اپنے دل کے ہنگاموں سے ہے اے فلسفی! — گرچہ پیکارِ عناصر کا تماشائی ہے تو

ہیں حسینوں میں اسی حسنِ ازل کی جھلکیاں — نور تاروں میں ہے جسکا رنگ و بو پھولوں میں ہے

ذرہ ذرہ پر محبت کی تجلی ہے پڑی — ورنہ تار و پود عالم کا بکھر جاتا ابھی

پھوٹتی ہو جس سے کرن اس دل روشن کو میں — ڈھونڈتا پھرتا ہوں یارب جلوہ گاہ حسن تری

حرکتوں پر حرکتیں ہیں برکتوں پر برکتیں — محفلِ ہستی میں تو ہنگامہ آرا جب سے ہے

تھک گئی چشمِ تخیل کثرتِ انوا سے — کون کہہ سکتا ہے یہ تاروں کی محفل کب سے ہے

کرتی ہے ہر دم مرے نخلِ تمنا کا طواف — کیوں تری برقِ نظر پڑ میں جلا گردان جس

اس چمن میں جن کو قدرت نے دیا تھا گوش ہوش — نالۂ خاموش میرا سن کے حیراں رہ گئے

(اردو اخبار" ... ۱۹۱۲ء)

جوشِ فیاضی میں آکر کہتی ہے بادِ بہار — دامن کہسار میں بھر دوں گی پھولوں سے چمن

شاہدِ رحمت ترا جب کھول کر آیا نقاب — میرے ظلمت خانۂ عصیاں کو روشن کر دیا

حقیر جان گدایانِ عشق کو نہ سلیم! — کہ تاج و تخت نہ ہو پھر بھی شاہ ہیں یہ لوگ

(اردو اخبار" نمبر ۱۵ ... ۱۹۱۲ء)

ہر ورق پر ہیں چمن فردوس کے پھولے ہوئے — دیکھ میری طبعِ رنگیں کی ذرا گلپاشیاں!

حسنِ جنت کی جھلک تو نے اگر دیکھی نہ ہو — میرے فردوسِ تخیل میں ذرا آ اے نکتہ چیں!

شعلہ رو حوریں ہیں فردوسِ تخیل میں مرے — گر پڑے عکس اُن کا دنیا پر تو دنیا جل اُٹھے

سیر کرنے کو نہ آیا کوئی بھی صاحب نظر — میری کشتِ فکر سے کیا کیا نئے عالم اُگے

جو تخیل کے فرشتے عالمِ معنیٰ میں تھے — رہ گئے تھک تھک کے میری رفعتِ پرواز سے

(اردو اخبار ۱۵ اگست ۱۹۱۲ء)

دیکھنا اے شاہدِ مضموں ہے حسن اپنا اگر تیرے آگے دل مرا رکھدیگا آئینے ہزار

خونچکاں ہیں ہمنوا! میری ترنم ریزیاں نقل میری کرکے مرغانِ چمن بسمل ہوئے

اے حاجی آج دیکھا تونے حرم کو لیکن میری نظر جدا ہے تیری نظر جدا ہے

میں جس کو دیکھتا ہوں وہ ہے خدائے خانہ تو جس کو دیکھتا ہے وہ خانۂ خدا ہے

(اردو اخبار ۱۰ ستمبر ۱۹۱۲ء)

ہر ایک قوم کے اخلاق ہو رہے ہیں پست ہر ایک مُلک پہ ظلمت کی چھا رہی ہے گھٹا

کہاں ہے اہلِ سیاست کی اب وہ رائے بلند کہاں ہے فلسفیوں کی وہ فکر پردہ کشا

کوئی لیلیٰ نظر آتی نہیں یاں ورنہ سلیم ہیں بہت لوگ کہ ہو جائینگے مجنوں آ بھی

اس فضا میں ہے جہاں اس کی تجلی برق پاش آتی ہے جبریل کے پر کو صدائے دورباش

جستجو میں جس کی ازخود رفتہ ہے عالم تمام کر رہا ہوں میں اُسے عالم کی ہر شے میں تلاش

حسنِ فطرت سے تلاطم ہے سمندر میں بپا موج میں نغمہ بھی ہے اور رقصِ مستانہ بھی ہے

کھینچتا ہے لالہ زارِ دہر کا نقشہ مجھے اس مرقع میں خزاں کا رنگ جھلکانا بھی ہے

نہ چھوٹے گا پریزادوں کا لپکا اے جواں تجھ سے

جوانی کا یہ جن جب تک نہ اُترے گا ترے سر سے

تہیدستوں کے ہاتھوں سے اُڑینگی دھجیاں تیری

نکل اے دامنِ دولت ذرا دستِ تونگر سے

بصارت اور بصیرت میں نہ کوئی روشنی ہوتی
نہ ٹکراتیں جو موجیں حُسن کی آ آ کے باہر سے

ترقیاتِ بشر بھی شاید، کبھی نہ ہوں گی تمام یارب
دلوں کے اندر جو بھر دیئے ہیں یہ ولولے بیحساب تو نے

سبق یہ فطرت سے تو نے سیکھا ہے شاید اے اُلفت آشنا دل
حسین سے بھی حسین تر ہیں کئے ہیں جو انتخاب تُو نے

الٰہی یہ زندگی کی منزل، سکونِ دل سے ہو کس طرح طے
کہ پہرہ دینے کو ہر قدم پر، اُٹھا دیئے انقلاب تو نے

کروڑوں صدیاں گذر گئی ہیں، مگر وہی جوشِ ارتقا ہے
رگوں میں اس عالمِ کہن کی بھری ہے روحِ شباب تو نے

جذبات پہ چھائے گی اُداسی، جب دھوپ شباب کی یہ سرکی
ہر شے نظر آئی مسکراتی برکت ہے یہ خندۂ سحر کی
باہر ہے سمجھ سے دورِ ایام ملتی نہیں تھاہ اِس بھنور کی

شب سمندر نے کہا یہ شاہدِ مہتاب سے دیکھ اپنا حُسن اس آئینۂ سیال میں

گوشِ ہوش اے غافلو لاؤ کہیں سے مستعار ہر زبانِ برگ میں پنہاں ہیں لاکھوں زمزمے

(عالمگیر جون ۱۹۲۶ء)

سر دھن کے رہ نہ جائے تو اے طائرِ چمن — گائیں گے اک ترانۂ رنگیں چمن میں ہم
ہے جی میں ہو کے نعرہ زناں تیرے عشق میں — اک زلزلہ سا ڈال دیں چرخِ کہن میں ہم
پہلو میں لائے ہیں دلِ افسردہ اپنے ساتھ — ہیں اک چراغِ کشتہ تری انجمن میں ہم
ہیں دیکھتے ہنسی میں تری موجِ زندگی — پاتے ہیں موت تیری جبیں کی شکن میں ہم
اے شیخ جب نظر میں نہ تیری سما سکے — پیدا کریں گے راہ دلِ برہمن میں ہم
پرتو ہے تیرے حسن کی نیرنگیوں کا یہ — پاتے ہیں رنگ و بو جو گل و یاسمن میں ہم
جس کی خاطر سے چکا تھا دین و دنیا کو جواب — اُن تمناؤں کی اب کرنی ہے قربانی مجھے

("خمخانۂ جاوید" جلد چہارم ص ۲۴۸)

حضرت حافظ کے شہپارے

(اُردو زبان میں)

حافظ شیرازی کے اشعار کا نظم میں آزاد ترجمہ

نگاہِ پیرِ مغاں نے کیا جو مست مجھے ۔۔۔ تو آئی غیب سے کانوں میں اک صدائے حزیں
کہ فرشِ خاک پہ تو رہ گیا اُلجھ کر حیف! ۔۔۔ خدا نے تجھ کو بنایا تھا مرغِ عرش نشیں،

پکارتے ہیں ترے ہمصفیر حیرت سے ۔۔۔ پسند آئی تجھے کیوں یہ دامگاہِ زمیں،
ہوائے قیدِ غلامی کا تو نہ ہو خوگر ۔۔۔ قفس کو توڑ کے اُڑ سوئے بامِ عرشِ بریں،

حریفو! آؤ نئے پیکرِ اُمنگ اپنی دکھائیں ہم ۔۔۔ فلک کی چھت گرا کر اک نئی بنیاد اُٹھائیں ہم
کرے گر حملہ فوجِ غم تو ہم ساقی سے مل جائیں ۔۔۔ پھر آبِ آتشیں پیکر دھوئیں اُس کے اُڑائیں ہم

بغور دیکھ زمانے کو جس میں ہیں توام ۔۔۔ چراغِ مصطفوی اور شرارِ بولہبی
بھری مفرّح گلگوں ہو جس میں لے ساقی ۔۔۔ وہ لاصراحی چینی و شیشۂ حلبی

گر اس زمانہ میں یاران بے خطر چاہو — تو ہیں وہ بادۂ گلرنگ و ساز خوش آہنگ
جو چاہو صدموں سے بچنا تو تم رہو تنہا، — کہ اس جہاں میں گزرگاہ عافیت ہے تنگ
گنج قاروں جو ہوا برباد اُس کی داستاں — ہے نشانی کو کہ وہ رکھے نہ زر اپنا نہاں
محتسب ہم بھی سیکھیں گے طریق مے کشی — مست رہتا ہے، نہیں پر اُس سے کوئی بدگماں
کل شب یہ میں نے دیکھا، آکر ملائکہ نے — میخانۂ ازل کی زنجیر در ہلائی
پتلا ابو البشر کا پھر ڈھالنے لگے وہ — مٹی کے گوندھنے میں دارو بھی کچھ ملائی
صہبائے عشق تھی وہ۔ پوچھا جو میں نے اُن سے — پھوٹی جو اس کی خوشبو مستی سی مجھ پہ چھائی
لعل و یاقوت کا یاں کوئی طلبگار نہیں، — ورنہ قدرت کے ہیں آثار ہمہ گیر وہی
سنگ میں رنگ پذیری کا وہی ہے جوہر — اور سورج کی شعاعوں میں ہے تاثیر وہی
چہرہ کو اگر غازہ لگائے کوئی بدرو — کیا اس سے وہ ہو سکتا ہے معشوق گل اندام
آئینہ تو جام بھی کسوت میں ہے رکھتا — کیا اس سے سکندر کا وہ ہو جائے گا ہمنام
رکھ لے کوئی ٹوپی کو اگر سر پہ ذرا کج، — کیا اس سے وہ ہو جائے گا ہمرتبہ حکام
سر اپنا منڈا کر نہ ہوا کوئی قلندر — جب تک کہ وہ اوصاف قلندر میں رہا خام
یہ کیا کہا کہ مری بزم میں نہ کھول زباں — چمن میں مرغ چمن رہ سکیگا کب خاموش؟
گیا وہ وقت کہ اہل نظر تھے گوشہ نشیں — بھرے تھے سینہ میں اسرار اور لب تھے خموش

کریں گے راز وہ فاش اب صدائے سازکیسا تھ
کہ تھا چھپانے سے اُس کے ہر ایک سینہ میں جوش

بس اپنی مصلحتیں حکمراں ہی جانتے ہیں،
گدائے گوشہ نشیں کا عبث ہے جوشِ خروش

مجھ پہ آثار جنوں کے نہ ہوں کیونکہ طاری
رکھتا اُس کے رُخِ پُر نُور کا سودا ہوں میں

شب مہتاب میں ہوں چاند سے باتیں کرتا
خواب میں دیکھتا پریوں کا تماشا ہوں میں

ہمدمو! آؤ کہ میخانہ میں لیں جاکے پناہ
آفتیں چرخ بریں سے ہیں برستی پیہم

دیکھتا ہوں میں صنم خانہ میں وہ نُورِ خدا
جس پہ زیبا ہے کہ پروانہ بنے شمعِ حرم

دو دانۂ گندم کے عوض باپ نے میرے
جنت کو دیا بیچ - یہ افسانہ ہے مشہور

بیچوں گا میں اِک دانۂ جَو کے عوض اُس کو
فرزندِ رشید اُس کا ہوں۔ یہ ہے مجھے منظور

رکھتے ہیں آستیں میں خزانہ چھپا ہوا
ظاہر میں گرچہ مُفلس و بے مال و زر ہیں ہم

رکھتے نہاں بغل میں ہیں جامِ جہاں نُما
ظاہر میں گرچہ خاک سرِ رہ گذر ہیں ہم

اعدا کو ہم پیٹتے خونیں کفن میں ہیں
پہناتے دوستوں کو قبائے ظفر ہیں ہم

میکشی جس میں نہ ہو بُوئے ریا اے صوفی!
دم کشی سے تری بہتر ہے، ریا ہو جس میں

یارب! مرے اندر ہے کون چھپا بیٹھا؟
گر چُپ ہوں تو سُنتا ہوں میں شورِ بلند اُسکا

پرستش ہوتی ہے آتشکدے میں اس لئے میری
کہ میری آتشِ دل بجھ نہیں سکتی قیامت تک

کیا وہ دلکش دُھن تھی، جو میں نے سُنی روزِ الست
عمر گذری، پر وہی نکہت بھری کانوں میں ہے

فضائے گوش میں میرے بھری ہے وہ آواز
سما سکی جو نہ اس گنبدِ زبرجد میں،

لوگ جس راز کو اب تک ہیں چھپاتے آئے
آج میں کہہ کے رہوں گا اسے مر جاؤں تو جائے

مئے گلرنگ پلا، تا کہ بتاؤں میں تجھے
کہ میں کس رنگ پہ دلدادہ ہوں کس بُو سے مست ہوں

یوں، کہ جھکتا نہیں سر میرا کسی کے آگے
بارِ احساں سے ترے مری گردن ہے جھکی

عمر گذری تھی کہ لائی تھی مہک تیری نسیم
ہے مشامِ دل و جاں رشکِ سمن زار ہنوز

خون پانی ہو کے بہہ جائے تو بہہ جائے۔ مگر
وہ پسیجے۔ اس کا امکاں صبحِ محشر تک نہیں

اس مُنبّت کار چھت پر ہیں یہ کیا نقش و نگار
عقل حیراں ہے، معمہ کھل نہیں سکتا ہے یہ

ٹھیک اترے نہ بے ڈول بدن پر تو ہے بات اور
ورنہ ترا خلعت نہیں بد زیب کہیں سے

پیرِ مغاں سے کیا تجھے نسبت ہے زاہدا!
تیری نگاہ لطف کبھی ہے۔ کبھی نہیں،

ہشیار ہو کہ چشمہ ہے منزل سے دور تر
دھوکا نہ کھائیو۔ کہیں جھل مل کو دیکھ کر

کہتے ہیں جس کو عشق۔ وہ ہے مختصر سی بات
پھر ہر زباں پہ اس کی ہے اک داستاں نئی

لے جنسِ بیخودی۔ گر لینی ہے میکدہ سے
بازارِ خود فروشی اُس پار ہے یہاں سے

کہاں وہ تختِ ہوا، اور کہاں وہ منطقِ طیر
وَرق وَرق ہوا برباد سب فسانۂ جم

اے شبِ وصل! نہ بھولوں گا وہ تیرے لمحے
پھونکتے تھے جو نئی روح بدن میں ہر بار

ہاروت سے سیکھوں گا میں تیرے لئے جادو
پروا نہیں جھانکوں جو میں اس دھن میں کنوئیں بھی

وصف پہ نہ کیوں مور کو ہو طعن کی جرأت — قدر اُس نے جانی کبھی انگشترِ جم کی

نازک ہے کہیں بال سے بھی عمر کا رشتہ — کھینچے اگر اپنے تئیں انسان تو خطا ہے

رازِ درونِ پردہ کی رندوں کو ہے خبر — لڑتا ہے مدّعی! تو عبث پردہ دار سے

دودھ کی بُو ابھی آتی ہے ترے ہونٹوں سے — سخت جانوں پہ نہ کر تیغ۔ عَلم جانے دے

معشوق بغل میں ہے، تو ہے ہاتھ پہ جام آج — میں شاہِ جہاں کو بھی سمجھتا ہوں غلام آج

نیت ہے لپکتی مری ہر طفلِ حسیں پر — اس شہر میں کتنے ہیں، یہ نیت نہیں جن کی

آگے سے ترے روز گزرتا ہے وہ۔ غافل! — دیکھے نہ اسے تُو، تو یہ آنکھوں کا خلل ہے

مستی میں کل فقیہ نے فتویٰ دیا یہ عام — بہتر ہے مالِ وقف سے۔ مَے گرچہ ہے حرام

جو کچھ کہ پلائے تجھے ساقی۔ وہ پیئے جا — ہے عینِ کرم۔ گر مجھے تلچھٹ ہی عطا ہو

اگرچہ ابرِ دُر افشاں ہے۔ اور ہوا گُل بیز — بجا کے چنگ نہ پی مَے۔ کہ محتسب ہے تیز

کوئی ہم مشرب ملے گر اور مَے گلگوں ملے — جام مَے بھر بھر کے پی۔ دُنیا ہے فتنوں سے بھری

پھونکتا اُس پہ ہر اک شخص ہے افسوں لیکن — دیکھیے کس کے فسانے کی ہو تاثیر اُس پر

وہ چیز اس سے کہ ہوتی ہے عشق کو تحریک — نہیں ہے وہ لبِ لعل اور خطِ زنگاری

خوبیاں اور بھی ہیں، چاہئیں معشوق میں جو — حُسن کچھ چشم و رُخ و زُلف و جبیں کا نہیں نام

پری ہے پردہ میں اور دیو ناز میں مشغول — نہ کیوں ہو عقل کو حیرت یہ دیکھ کر منظر

حسن تو بصرہ سے اٹھیں حشن دامن پاک
زمین مکہ سے بو جہل ہو یہ حیرت ہے

جمال دختر انگور دیکھنا ہو اگر
نقاب شیشہ اُلٹنے دو روئے روشن ہے

ہر ایک فعل روا ہے بجز دل آزاری
ہماری شرع میں اس کے سوا گناہ نہیں

قدم قدم پہ ٹھہرتا چل اے غیرت خوباں!
کہ ہے ہجوم سر راہ داد خواہوں کا

عقاب ظلم نے کھولے ہیں بال و پر اپنے
خدنگ نالۂ مظلوم ہے کہاں یارب!

جلوہ معشوق کا ہے دیر و حرم میں یکساں
کفر و اسلام اسی شمع کے پروانے ہیں

ناز اعمال پہ زیبا نہیں تجھ کو زاہد!
حشر کیا ہوگا ترا، اس سے بھی آگاہ ہے تو؟

اے صبا! آج کی شب ہو تو ہوا خواہ مری
کہ میں گل بن کے کھلا چاہتا ہوں وقت سحر

چاہا یہ شمع نے کہ کرے راز وصل فاش
شعلے نے بس لپک کے زباں اس کی تھام لی

بے فکر پھر رہا تھا میں۔ پرکار کی طرح
گردش نے مجھکو مرکز آفات کر دیا

لالہ کی پنکھڑی پہ یہ لکھا ہے خون سے
بے داغ دل نہیں ہے جہاں میں بہار عیش

تو نے مستی میں دیا چہرہ سے جب پردہ اٹھا
تیرے جلوہ سے ملائک میں ہوا حشر بپا

خرمن زہد ریائی میں لگی آگ اے شیخ!
پھینک اس خرقہ کو۔ گر جان بچانی ہے تجھے

غنچہ ہے تو ابھی۔ تری لاکھوں ہیں بلبلیں،
کیا ہوگا۔ جب بہار پہ آئے گا اپنی تو

تو ہو عاشق۔ تو کرے حال پہ تیری وہ نظر،
جب نہیں درد تو کیا شکوہ مسیحائی کا؟

دیکھ ہاتھوں سے نکل جائے نہ وہ کشتیٔ نوح　　کہیں طوفانِ حوادث سے نہ برباد ہو تو

بے مے و جام کٹی ساری جوانی یارو!　　سنبھلو پیری میں کہ ہے وقت قضا کا باقی

ساقیا! پلا تو مجھ کو اب ایسی مئے کہن　　جس سے نہ کچھ خبر رہے دُنیا و دین کی،

دودھ کی بُو ابھی آتی تھی ترے مُنہ سے کہیں　　تھا یہ کتنا ملاحت میں حلاوت کیسی؟

عشق وہ دشتِ بلاخیز ہے یارو جس میں　　شیر کا نشۂ صولت بھی ہرن ہوتا ہے

کیا ترے جی میں ہے لے شعلۂ رخشندہ! بتا　　کہ لپک سر تری سینے ہوئے جاتے ہیں کباب

مصلحت سے ہے زبانوں پہ یہاں مُہر لگی　　ورنہ رندوں کو ہے ہر رازِ نہانی معلوم

اِک جذبہ ہے پوشیدہ مرے سینہ کے اندر　　شاید کہ یہی جذبہ مجھے دار پہ کھینچے

منزلِ عشق میں ہر سُو ہے بچھا دامِ بلا،　　ہیں کہاں شیر دل ایسے کہ بلا سے نہ ڈریں

کیا ہے تو نے ہی برباد گرچہ مجھکو. مگر　　پڑے نہ گردِ مری کاش! تیرے دامن پر

یہ میکشی بھی عجب کیمیا ہے لے زاہد!　　کہ اس سے خاک کو دیتا ہے رنگِ زر ساقی

نکل سکا ہے نہ تو حلقۂ طبیعت سے　　تو پھر ہو کوئے حقیقت میں کب گذر تیرا

نہیں ہے پردہ رُخِ یار پر، مگر غافل!　　ہٹا غبار تو رستے سے. تا وہ آئے نظر

تو چھُری گردنِ آہو پہ نہ رکھ لے صیّاد!　　اِن سیہ آنکھوں سے کیا شرم نہ آئیگی تجھے

دُنیا میں ہے سو بار کا یہ تجربہ زاہد!　　جو شخص کہ میخوار سے اُلجھا، وہ ہوا خوار

جو رازِ حق کہا تھا کسی سے نہ شیخ نے — حیرت ہے میفروش کو کس نے بتادیا

مسجد میں چھپ کے آج ہی پی تھی نہ ہم نے مے — پیرِ مُغاں سے یہ گلہ سو بار سے ہے سُنا

محرم نہیں ہے کوئی، کس سے بیاں کروں میں — کیا کیا سُنا ہے میں نے کیا کیا ہے میں نے دیکھا

ہم بانگ چنگ پر نہیں پیتے کچھ آج سے مے — مدت سے آسماں نے ہے یہ غلغلہ سُنا

بس کر لے زاہد خود بیں، کہ مجھے اور تجھے — رازِ قسمت نہ ہوا ہے کبھی معلوم نہ ہو

قدرت جو رنگ لعل کا دیتی ہے سنگ کو — کرتی ہے پرورش اُسے خونِ جگر کے ساتھ

پایا نہیں کسی کو اُس کے نشاں سے واقف، — یا میں ہی بیخبر ہوں، یا وہ ہی بے نشاں ہے،

شبنم بھی ہے اس راہ میں اک چشمۂ آتش، — یہ ہے وہ مُعمّا کہ بیاں ہو نہیں سکتا،

عشق کا ولولہ ہر دم ہے مرے دل میں نیا — ہر گھڑی کاش ترے حسن کی ہو شان نئی

خرابیاں بھی سہی کچھ شراب میں۔ لیکن — نہ خوبیوں کا ہو منکر، عوام کی خاطر

چھپاؤں دل کی لگی کو، کہاں یہ ممکن ہے — کہ جھڑتی رہتی ہیں چنگاریاں زباں سے مری

فدا کر جان اپنی ایسے معشوقِ سمن بر پر — نہ ہو زیور کی حاجت جس کے حُسنِ روح پرور کو

ہم رندوں کی صحبت سے کنارہ نہ کر اے شیخ! — کوثر کے کنارہ پہ یہ ساغر نہ ملے گا،

دی ساقیٔ ازل نے مجھے وہ شراب تند — جس کا اُتار ہو نہیں سکتا ابد تلک

آج اک بتِ رعنا سے مری آنکھ لڑی ہے — بتخانۂ آذر میں نہ ہو گا صنم ایسا

("[illegible]")

دیکھا اُسے جس نے مری آنکھوں کو بینا کر دیا ہے ۔ کیا جو ہری آنکھیں مجھے قدرت سے ملی ہیں

اک جامہ دُ فروش نے جس کو پلا دیا ، پردے سب اُس پہ فرش سے تا عرش کھل گئے

جامِ جہاں نما جسے دیتا ہے مئے فروش اسرار اس پہ کھلتے ہیں کون و مکان کے

طبیبِ عشق یہ مانا کہ ہے مسیحا دَم نہ ہو جو درد ۔ تو پھر کس کا وہ علاج کرے

دائرہ چرخ کا کھینچا گیا کس نقطے پر نہیں اِس نکتہ سے کوئی بھی خبردار ابتک

بجلی اک بُرقعِ لیلیٰ سے نکل کر کوندی خرمنِ ہوش پہ مجنوں کے گری ہو شاید

جامِ مَے دے مجھے ساقی کہ نہیں کچھ معلوم ہیں چھپے پردۂ تقدیر میں کیا کیا اسرار

چاہو تکفیر سے بچنا تو پیو چھُپکر مَے چنگ کی ہے یہ صدا ۔ عود کی تقریر ہے یہ

ساحل سے دور بحرِ حقیقت کے ہو گئے لہریں اُٹھیں دلوں میں جو وہم و خیال کی

نہ پا سکے جو حقیقت ، تو وہم سے لڑنے لگے حقیقت ایک تھی ، وہموں کا کچھ شمار نہ تھا

بوجھ امانت کا وہ گردن پہ اُٹھایا میں نے جس سے کاندھے فلکِ پیر کے تھک ٹوٹ گئے

آدمؑ اک دانہ سے بہکے تو بھلا کیونکر ہم رہ سکیں راہ پہ اس خرمنِ پندار کے ساتھ

شمع کی آگ بھی کیا آگ ہے اے طالبِ عشق آگ وہ ہے جو بھڑکتی دلِ پروانہ میں ہے

نوش بے نیش نہیں اور نہیں گل بے خار چارہ پھر کیا ہے ، اگر وضع جہاں کی ہے یہی

بھر دے قدح شراب کا پھر گوش ہوش سے جمشید و کیقباد کی سُن اُس سے داستاں ،

حسن نے تیرے ازل میں جب دکھائیں جھلکیاں   آگ دنیا میں لگا دی عشق نے ہو کر عیاں

چاہتا تھا مدعی، داخل ہو بزمِ راز میں   آ کے دستِ غیب نامحرم کو پسپا کر گیا

عقل نے چاہا، کرے روشن چراغ اس شعلے سے   اس کی ضو نے عقل کی آنکھوں کو اندھا کر دیا

ایماں کے ساتھ ساتھ ہے یاں کفر بھی ضرور   کس کو جلائے آگ اگر بولہب نہ ہو

نماز میں خمِ ابرو جو اس کا یاد آیا   ہوا یہ حال، کہ محراب بھی لگی رونے

لکھا ہے چرخ پر یہ سنہری حروف میں   ہر چیز کو فنا ہے۔ بجز جود اہلِ جود

ہیں راہِ عاشقی میں نادر بہت تماشے   اس دشت کے ہرن سے ہیں شیر نر لرزتے

جامِ جمشید سے تو مانگتا کیا ہے اے دل   مانگتا غیر سے جو شے ہے وہ ہر پاس ترے

ہو مدد روحِ قدس کی جو میسر ہم کو   ہم بھی کر سکتے ہیں، جو کچھ تھے مسیحا کرتے

نہ دیکھ چشمِ حقارت سے خاکساروں کو   کہ اس غبار میں شاید چھپے سوار بھی ہوں

عشق کے راز کا ہے علمِ یقینی کس کو   کام لیتا ہے ہر اک فہم و گماں سے اپنے

ادب سے ہاتھ میں لے جامِ مے، کہ اے غافل   بنا ہے خاکِ سرِ کیقباد و جم سے یہ جام

اے کبوتر! یہ فریب اس کا ہے تو پابندِ جا   حج پہ باندھی ہے اگر گر بہ نہ سکیں نکلے

بات کرتا نہیں گو مجھ سے وہ از راہِ غرور   پر اسی کم سخنی پر ہے فدا جان مری

شاہِ توراں ہے سخن سازوں کی باتوں میں فریب   شرم آنی چاہیے خونِ سیاوش سے تجھے

نہیں تقدیر میں لغزش ہوئی" کہتا ہے تو شیخ!
آفریں اس ترے اندازِ خطا پوشی پر

غیرتِ عشق نے دی کاٹ زباں خاموشی کی
پھر یہ راز اس کا کہاں سے ہوا معلوم عوام

تیر بادِ رن کے تیرا عشق تھا داخل ہوا
اب جو نکلے گا تو بس نکلے گا میری جاں کیسا تھا

اے خضر! دستگیر ہو اس راہ میں مرا
میں ہوں پیادہ پا۔ مرے ساتھی سوار ہیں

شراب خانے میں آ، تا کہ چہرہ ہو گل رنگ
نہ خانقاہ میں جا کر سیاہ کاری سیکھ

گم ہوئی عقل مری۔ ہے یہی گرمی کا اثر
ہے یقیں مجھکو کہ ایماں پہ بھی گزرے گی یہی

پیو شراب بتِ سیمتن کے ہاتھوں سے
نہ واعظوں سے سنو، داستانِ عاد و ثمود

پیرِ کنعاں کی ہے آنکھوں پہ سفیدی چھائی
ماہِ کنعاں کی خبر مصر سے آئی نہ ہنوز

صحبتِ گل ہے غنیمت، کہ وہ گلشن میں ابھی
آیا اس راہ سے، اس راہ سے جائیگا نکل

بازوئے زاغ میں سے ہے کہاں طاقتِ شکار
شہباز ہی کو ہے یہ فضیلت عطا ہوئی

جلوت میں جن پہ شانِ تقدس ہے آشکار
خلوت میں جا کے کرتے ہیں کچھ اور کام وہ

پوچھوں گا میں یہ مسئلہ واعظ سے کہ اس پر
دل میں مرے کیا کیا ہیں خیالات گزرتے

توبہ کی ہدایت جو ہمیں کرتے ہیں اکثر
صد حیف! کہ وہ آپ ہی توبہ نہیں کرتے

دیکھتا چشمِ حقارت سے ہے کیا اپنے تئیں
خود کو پہچان، کہ پہچان خدا کی ہے یہی

تو کرے گا یہ ہوا میں، کب تلک اٹکھیلیاں
اے کبوتر! دیکھ وہ گرنے کو ہے تجھ پر عقاب

شعیبؑ کی نہ کریں چند سال خدمت اگر ــ تو کامیاب نہ ہوں گے جنابِ موسیٰ بھی

میں ہی کچھ وادیِ ایمن سے اُٹھاتا نہیں فیض ــ آگ لینے کو چلے آتے ہیں یاں موسیٰ بھی

ہے خبر کس کو، کہ ہے منزلِ مقصود کہاں ــ سُنتے البتہ ہیں یاں بانگِ جرس دور سے ہم

نہیں، اور انکار کروں ساغرِ مے سے اے شیخ ــ تجھ سے تو عقل بہرحال ہے افزوں میری

جہاں میں زندگی اس طرح کر بسر ہمدم! ــ کہ تجھکو مردہ نہ سمجھیں، اگر تو مر جائے

کہا مجنوں نے لیلیٰ سے کہ ہیں عاشق بہت تیرے ــ مگر دُنیا میں مجھ سا کوئی مجنوں ہو نہیں سکتا

ہمراز کسی جمع ہیں موقع ہے غنیمت ــ در بند کرو، تا نظرِ بد سے بچیں ہم

حریفو آؤ بانگِ نے پہ جامِ مے پئیں ہم تم ــ فسونِ شرع ان باتوں سے باطل ہو نہیں سکتا

رباب و چنگ یہ کہتے ہیں اہلِ محفل سے ــ کہ گوشِ دل سے سنو اہلِ راز کا پیغام

ہزار بار ملا مجھ سے وہ۔ مگر ہر بار ــ یہ پوچھتا ہے کہ ہو کون تم، بتاؤ مجھے

قدرت کے ہیں کچھ بھید، کہ کرتی ہے یہ ظاہر ــ ہے کوئی، جو سمجھے گلِ سوسن کی زباں کو

مہوسوں سے یہ کہدو کہ ہیں وہی درویش ــ قلوبِ قلب کی جو کیمیا گری جانیں

دل اس کو دیدیا۔ سمجھا نہ اس سے پہلے میں ــ کہ ڈال سکتا ہے سایہ پری کا انساں بھی

شاعری کے میں یہ کرتا ہوں کھلونے تیار ــ آرزو ہے کہ انھیں وہ بُتِ کم سن دیکھے

ہے توقع کہ کوئی جوہری ان کو پرکھے ــ یہ جواہر جو طبیعت کے دکھاتا ہوں میں

سامری ہاتھ ہلاتا یدِ بیضا سے ۔ مگر　　سحر کا معجزہ پر چل نہیں سکتا افسوں
کیا ہی دل کش تھا وہ نغمہ ۔ جو سنا روزِ الست　　گونج ہے گنبدِ گردوں میں ابھی تک اُس کی
گر اس طرح سے لبریاں کہ پاؤں پھسلے　　فرشتے ہاتھ ترا تھامنے کو دوڑ پڑیں ؛
قہقہہ یاد ہے اُس کبکِ دری کا مجھ کو　　تھا جو سرپنجۂ شاہینِ قضا سے غافل
افیون دی شراب میں ساقی نے جب ملا　　ہم کو رہی نہ کچھ سرود ستار کی خبر
وہ سامنے دیکھو، ہے سعادت کی پڑی گیند　　آتے نہیں میداں میں، سواروں کو ہوا کیا،
چھایا ہے اگر غم کے سبب تجھ پہ بڑھاپا　　پی ساغرِ مے ہاتھ سے اِک تازہ جواں کے
آج کے عیش کو توکل پہ نہ ڈال اے ساقی!　　ورنہ لا خطِ اماں دفترِ تقدیر سے تو
دو زانو ہو کے اِک مُنہ پارہ دیتا ہے مئے حمر　　نہیں موقع یہ توبہ کا، ذرا تو دل میں شرما تو
رہتی ہے دوڑ دھوپ میں سورج کی ہر کرن　　کس برقِ جلوہ کی اسے یارب تلاش ہے
دے پردہ رُخ سے دخترِ انگور کے اُٹھا　　گر شب کو دیکھنی ہے تجھے تابِ آفتاب
لا وہ مئے گلرنگ کہ ہوں رشک سے اُس کے　　چنگاریاں پیدا دلِ نسرین و سمن میں
مر کے رہنا ہے تجھے شہرِ خموشاں میں تو اب　　کیوں نہ دے غلغلہ تو گنبدِ افلاک میں ڈال
کیا قیامت ہے کہ اک جُرعۂ مے کی خاطر　　جس سے خاطر پہ کسی کی بھی نہ پہنچے گا ملال
جھیلتا زاہد و واعظ کے ہوں طعنے دن رات　　کیا کچھ انصاف ہی یہ، ان سے ذرا کیجے سوال

زاہد! درِ میخانہ سے چُپ چاپ گزر جا!
ایماں کو ڈبو دیتا ہے یہ بادۂ پُرجوش

عیش کے واسطے ہے اتنا ہی ساماں درکار
ایک ہو شیشۂ مے، ایک ہو معشوق حسین

چاہتا ہے تو اگر، ہو خضر تیرا آشنا
آبِ حیواں بن کے ہو چشمِ سکندر سے نہاں

یہ واعظوں کا بھی مشرب ہے کچھ عجیب کہ وہ
حرام جانتے ہیں مے کو، اور ریا کو حلال

گر تین مہینے پیو تم بادۂ صافی
نو ماہ ہیں تقوے کے لئے کافی و وافی

چشمِ وفا کسی سے رکھو نہ تم، وگرنہ
عنقا کی جستجو میں دُنیا کو چھان مارو

نظارۂ حرم سے، شاید ہو کچھ تلافی
رستے میں حاجیوں نے کُلفت بہت اُٹھائی

اس آرزو میں کہ ہر روز ایک کوزہ ملے
شرابخانے کا حمّال بن گیا ہوں میں،

وہ تلخ و تند چاہیے مے جس کے زور سے
دُنیا کے شور و شر کی نہ مجھ کو خبر رہے

پی جامِ جم، کمند نہ بہرام کی اُٹھا
ہے گور میں وہ آج، جو کرتا تھا صیدِ گور

گرچہ خوں تیری نگاہوں سے ٹپکتا ہے، مگر
دودھ کی بو ترے ہونٹوں سے ابھی آتی ہے،

دُنیا سے جو محروم ہیں، اور دین سے محرم
رکھتے اُنھیں انسانوں سے برتر ہیں فرشتے

دیکھوں میں اُس کا جلوہ، سُنوں اُس کی گفتگو
اعضا مرے تمام جو بن جائیں چشم و گوش

خود فروشی ہے عبث، آدابِ مجلس ہے یہی
یا کرو باتیں سمجھ کر، یا رہو بالکل خموش

فلک نے گرچہ پلائے لہو کے گھونٹ مجھے
ہنسی کو اپنی نہ میں مثلِ لالہ روک سکا،

حق گوئی کا دعویٰ نہیں شبلی کو سزاوار حق وہ ہے جو منصور کہے دار پہ چڑھ کر

میں وہی کہتا ہوں جو کہتا ہے استادِ ازل آگے آئینے کے میں رہتا ہوں طوطی کی مثال

ہے کوئی جوہری ایسا کہ جو مجھ کو پرکھے معدنِ غیب کا اک جوہرِ نایاب ہوں میں

دھو سکا دینِ مُلمع سے نہ میں داغ ریا میں نے جب تک مے گلرنگ کے چھینٹے نہ دیئے

جو گنہ ہم نظرِ خلق سے پوشیدہ کریں اُس عبادت سے تو بہتر ہی ریا ہو جس میں

کس طرح کروں توبہ۔ کہ آتی ہے بہار اب اے موسمِ گل! توبہ شکن کہتے ہیں تجھ کو

یہ بھی کوئی انصاف ہے اے چرخ ستمگر! مے یار پئیں اور میں تکتا رہوں مُنہ کو

سر ہے مرا جھکا درِ میخانہ پر ۔ مگر مستی کے وقت میرا دماغ آسماں پہ ہے

ہوں گدائے درِ میخانہ۔ مگر وقتِ سرور میں ستاروں پہ چلاتا ہوں حکومت اپنی

لطف اُٹھانا ہو تو ملتے رہو معشوقوں سے اُن کے مذہب کے خلاف ان کا کرشمہ دیکھو

شکار ہو نہ کہیں تو فریبِ زاہد کا، چھپائی اس نے کمندیں ہیں آستینوں میں

یارب اُس صاعقۂ حسن کا ہو نُور نہ ماند جس نے پھونکا میرے ظلمتکدۂ روح کو بھی

لا بادۂ گلرنگ ۔کہ بتلاؤں تجھے میں گردش میں ستاروں کی چھپے راز ہیں کیا کیا

ہر نیا پھول جو کھلتا ہے چمن میں غافل! یاد اک شاہدِ گلرو کی دلاتا ہے مجھے

کیا اب بھی نہ جاگے گا ترا طالعِ خفتہ، خورشیدِ قیامت ترے سر پر نکل آیا

فکر اپنی ذات کی نہ اب اُس میں سمائیگی — معشوق سے بھری ہے کچھ ایسی فضائے دل

ابر رحمت کا کوئی مسجد سے چھینٹا یا رب! — اِس سے پہلے کہ اُٹھوں خاک سے تیا شغلِ آب

رقص کرتا ہوا میں خاک سے اُٹھوں شاید — شیشۂ مے مری تربت پہ اُلٹ دے ساقی

میں راز بتادوں گا تمھیں عہدِ ازل کا — رکھو تو ذرا ساغر و مینا مرے آگے

کر رہبری نے خضر! رہِ عشق میں میری — رستہ ہے دراز۔ اور مسافر ہوں نیا میں

ہاتھ پر لالہ کے جام مے ہے، نرگس مست پر — اپنی بدنامی کی یارب! کس سے چاہوں داد میں

غوطہ لگا چکا ہوں تیں دریائے عشق میں — سر دیکھئے کہ ڈوب کے نکلے کہاں مرا؟

گرد آلودِ فلاکت ہوں، مگر ممکن نہیں — چشمۂ خورشید کے پانی سے دامن تر کروں

آگ میں جلنا مرا معشوق کو آیا پسند — لاؤں گا خاطر میں کیوں اب چشمۂ کوثر کو میں

بادہ پیمائی نہ چھوڑوں گا دمِ آخر تک — آج پیماں ہے کیا میں نے یہ پیمانے سے

میں نہیں وہ کہ کروں ترکِ شراب گلرنگ — محتسب جانتا ہے، مجھ سے نہ ہوگا یہ گناہ

غیرت یہ ہے کہ چاند بھی بن جاؤں میں اگر — طالب نہ ہوں گا نور کا میں آفتاب سے

نقد جنّت چھوڑ بزمِ ساقی ہوش کی میں — جنتِ موعودِ واعظ کا کروں کیا اعتبار

قول زاہد ہے کہ فصلِ گل میں ترکِ مے کرو — مشورہ کرتا ہوں جا کر شاہد و ساغر سے میں

پھیر دے گا ایک دن پانی یہ زہد و علم پر — رنگ لائیگا ہمارا دیدۂ معشوقہ باز

چراغِ بادہ کی بتی کو دیں ملک کیا — نظارہ آج شب اس ماہوش کا ہے کرنا
میں محتسب نہیں ہوں، نہ قاضی نہ مولوی — رندوں کی روک ٹوک سے کیا فائدہ مجھے
چھپ کر شراب پینے سے اکتا گیا ہوں میں — اب چاہتا ہوں میں کہ پیوں بانگِ چنگ پہ
جم کی بربادی کا غم مٹ جائیگا دل سے ترے — گر رہیگا میکدہ میں تو دما دم جامِ جم
گر اسی طرح چمکتی رہی وہ برقِ جمال — نہ رہیگا یہ مرا خرمنِ ہستی محفوظ،
نہ کرے میری مدد روشنیِ طور اگر — کیا شبِ وادیِ ایمن کی ہو ظلمت کا علاج
چاہِ بیژن کی اسیری میں ہے آتا مجھے لطف — دستگیری نہ کرا اے دستِ تہمتن میری
نہیں آتے ہیں ترے دیکھنے والوں کو نظر — وہ کرشمے جو مجھے تجھ میں نظر آتے ہیں
ہوں کاش چند دن مرے میخانہ میں بسر — اکتا گیا ہوں مدرسہ کی قیل وقال سے
ساقیا بادۂ گلرنگ کا اک جام پلا — داستانِ جم و کاؤس سناؤں گا تجھے
مٹی میں مری روزِ ازل سے ہے ملی مے — ترک اس کو کروں، یہ مری طاقت سے ہے باہر
غبارِ جسم کا پردہ ہے چہرۂ جاں پر — اٹھا کے پردہ یہ چہرے سے جلوہ دکھلا تو
مجھ خوش الحاں کے لئے ہے یہ قفس کب زیبا — مرغِ آزادِ بہشتی ہوں، میں کیوں بند رہوں
چشمۂ مہرِ درخشاں کے کنارے تک میں — رقص کرتا ہوا ذرے کی طرح جاؤں گا،
کسی شہباز کی شاید کہ پڑے مجھ پہ نظر، — اسی امید پہ کرتا ہوں ہوا پر پرواز،

اک جام پلا کر مجھے، تو دیکھ تماشا ڈالوں گا ابھی ہاتھ میں جوزا کی کمر میں

چاندنی رات میں اکثر جو وہ یاد آتا ہے دوڑ کے چاند کے بوسے میں لیا کرتا ہوں

دیکھنے پائے نہ بد بیں اُن کو اے ستارِ غیب ہوتی ہیں خلوت میں سرزد مجھ سے جو بیباکیاں

عمر میخانہ کی دربانی میں گذری ہے مری پھر بھی جنت میں جگہ پانے کا ارماں ہے مجھے

مستی میں تعجب نہیں مجھ سے کہ کسی وقت، دل پردہ اُٹھا چہرۂ اسرارِ قضا سے

صاف کہتا ہوں، نہیں رکھتا کسی سے پاک میں عشق کا بندہ ہوں، اور کونین سے آزاد ہوں

میں فرشتہ تھا، کبھی فردوس تھا میرا مقام آدمِ خاکی سے لایا مجھکو اس ویرانہ میں،

جوش اُٹھتے ہیں خُمِ مے کی طرح دل میں مرے مُنہ مگر بند ہے، کچھ کہنے سے مجبور ہوں میں

بندے ہیں پادشاہ کے اور خیر خواہ ہیں، پر مُلکِ صُبحگاہ کے ہم پادشاہ ہیں

خطِ غبار میں لکھا ہوا یہ آندھی نے، کہ سرکشی کا نتیجہ ہے صاف بربادی

قسمت تو دیکھیے کہ ہم اِس باغِ دہر میں پیدا برنگِ لالہ ہوئے داغِ دل کے ساتھ

آبرو جاتی ہے اے ابرِ خطا پوش برس کہ ہیں کھولے ہوئے ہم نامۂ اعمال سیاہ

گلبنِ حسن ترا یوں نہیں سرسبز ہوا خونِ دل سے اُسے ہر روز ہے سینچا ہم نے

کشتِ دل میں تو اگر تخمِ وفا سبز کرے زرد روئی تجھے حاصل نہ ہوئیگا ہم درد

آشنا تھے جو رہِ عشق کے حیرت ہے کہ وہ اس سمندر میں ہوئے غرق، مگر تر نہ ہوئے

رکھتا ہے باز سر پہ ٹوپی اگرچہ ۔ لیکن، / مرغانِ قاف ہی کو زیبا ہے پادشاہی

گلہ یہ کس سے کروں اے خدا ۔ کہ دُنیا میں / کسی کو چہرہ دکھاتا نہیں وہ ہرجائی

تاجِ شاہی کی طلب ہے تو دکھا جوہرِ ذات / کیا ہوا، تُو ہے اگر نسلِ جم و دارا سے

کب چلے گا، کس سے تُو پوچھے گا منزل کا پتہ / تیری آنکھیں تب کُھلیں جب قافلہ چلتا ہوا

راہ میں اُلفتِ لیلیٰ کی بہت ہیں خطرے / قدم اُس راہ میں رکھ پہلے سی مجنوں بن کر

جمع اسباب ہیں، کرتا نہیں تو کام کوئی / باز ہے ہاتھ میں، کرتا نہیں تو پھر بھی شکار

جھیل سکتا نہیں کانٹوں کی جو ایذائیں تُو / دامن اپنا کبھی پھولوں سے نہیں بھر سکتا

آدم کی طرح عقل کی مانو گے جو باتیں، / جنّت سے پڑے گا تمہیں اِک روز نکلنا

پھونکتا تجھ پہ ہوں میں مثلِ صبا دم اپنا / کہ تو ہنستا ہوا کب غنچہ سے باہر نکلے

یہ آج کے فتنے مجھے آتے تھے نظر کل / جس وقت کہ بچپن میں مرا نام تھا اچپل

ہے یہ پیشانیِ ایوانِ ارم پر لکھا / کہ جو دُنیا کے کرشموں میں پھنسا حیف اُس پر

قُمری نے شاخِ سرو پہ گائی یہ راگنی / جو راستباز ہو، وہ ہے آزاد ۔ اور غنی

کل ایک کسان اپنے پسر سے تھا یہ کہتا، / جو بوئے گا اِس کھیت میں، کاٹے گا وہی تُو

کیا جسم ہے تیرا، کہ ہے وہ رُوح سراسر / کیا رنگ ہے تیرا، کہ ہے وہ نورِ مجسّم

رونقِ بزمِ جہاں ہو نہیں سکتی کم و بیش / میری بدکاری سے یا تیری نکوکاری کر

تاریکیاں دلوں کی یہ شاید کہ مٹ سکیں   روشن کرے چراغ جو خلوت نشیں کوئی

ہاتھ سے زہدِ ریائی کے میں تنگ آیا ہوں،   کیا مجھے مل نہ سکے گی مئے صوفی افگن

کروں میں گدائی میں بھی پادشاہی   مجھے چھوڑ دے اے نفسِ طامع! اگر تو

چاہِ بیژن میں ہوں قیدی شاہِ ترکاں کے سبب   ہے کوئی رستم کہ لے اب تجھ سے میرا انتقام

آدمی ملتا نہیں ہے کوئی، اس دُنیا میں جب   کیوں نہ اک دُنیا نئی پیدا کرے تو لے خدا

میدانِ حسن شہر میں ہے ہر طرف کھلا   کرنی ہے مشقِ عشق، تو آگے قدم بڑھاؤ

کرنے تھے چہچہے تجھے طوبیٰ کی شاخ پر   تجھ سا پرند، حیف! قفس میں اسیر ہو

ناچے اگر وہ بادۂ وحدت سے ہو کے مست   صوفی کی آستیں سے ہزاروں صنم جھڑیں

("اودھ اخبار" ۱۸-اپریل ۱۹۲۶ء)

ضمیمہ

مجموعہ ہذا کی کتابت ختم ہو چکی تھی، کہ مولانا کی یہ نظمیں دستیاب ہوئیں،
لہذا مجبوراً آخر میں درج کی جاتی ہیں۔ (اسماعیل)

برسات کا پہلا دن

دھندلا ہے آج منظر، مطلع پہ تیرگی ہے
اُٹھتا ہے کچھ دھواں سا رہ رہ کے آسمان پہ
بھیگی ہوئی ہوا ہے، بجلی تڑپ رہی ہے
جل تو جلال تو ہے، ہر ایک کی زباں پہ
دیکھو وہ سر اُٹھایا، سبزے نے بانکپن سے
مرجھا کے رہ گیا تھا، جو دھوپ کی کرن سے

(۲)

مرغابیاں ہیں بیکل، ہل چل ہے مچھلیوں میں
پا کر سنک ہوا کی، لہریں مچل رہی ہیں
طوطے لٹک رہے ہیں، آموں کی ڈالیوں میں
چیلیں گگن پہ چڑھ کر، پہلو بدل رہی ہیں
وہ سانپ رینگتے ہیں، سایہ میں یاسمن کے
طاؤس ناچتے ہیں، وہ صحن میں چمن کے

(۳)

ہیں اب کہاں وہ شعلے اٹھتے تھے جو زمیں سے — ہیں اب کہاں وہ کانٹے، پڑتے تھے جو زباں میں
ہیں اب کہاں وہ دریا، بہتے تھے جو جبیں سے — ہیں اب کہاں وہ پنکھے، کھنچتے تھے جو مکاں میں
وہ دھوپ چلچلاتی، آتی نہیں نظر اب — بادِ سموم کے وہ، جھونکے گئے کدھر اب

(۴)

دیکھو تو آسماں پر، کیا حشر سا ہے برپا — کیا جھوم کر گھٹائیں، پورب سے آ رہی ہیں
وہ بدلیاں گرج کر، کرتی ہیں شور کیسا — وہ بجلیاں چمک کر، کیا تلملا رہی ہیں
پروا ہے ٹھنڈی ٹھنڈی، بادل ہیں کالے کالے — لو آگیا وہ پانی، بہنے لگے وہ نالے

("معارف" علی گڈھ۔ جلد ۲ نمبر ۴ یکم نومبر ۱۸۹۹ء ص ۱۹۹)

بگلا

(۱)

ہاں ذرا دیکھو تو اِ بگلا ہے ہوا میں اُڑ رہا
پر سفید اُس کے ہیں، اور گردن ہے لمبی خوشنما

مچھلیوں کو دیکھکر، تھا تلملاتا بار بار
لو گرا پانی پہ وہ، پَر تول کر بے اختیار

(۲)

ہے سمندر اُس کا گھر، اُس کو ہوا سے کام کیا
لوٹتا رہتا ہے اُس میں، صُبح کیا اور شام کیا

کرتی ہیں اٹکھیلیاں پانی کی لہریں صُبح و شام
وہ سمندر کے چڑھا رہتا ہے سینہ پر مُدام

دھوپ میں ہوتا ہے دِن کو جب سمندر موجزن
گود میں اُس کی پڑا سوتا ہے یہ ہو کر مگن

نیلگوں پانی سمندر کا ہے گہوارہ اُسے
اور جگا سکتا نہیں طوفاں کا نقارہ اُسے

اُٹھتی ہیں پانی میں لہریں اور ہو کر بے قرار
پاس سے چھو کر نکل جاتی ہے اُس کو بار بار

(۳)

جس طرح سیلاب میں جاتی ہے مچھلی تیرتی
یا ہوا کے رُخ پہ کشتی جاتے ماہی گیر کی

اس طرح بگلے کو بھی لہروں میں اطمینان ہے
ہوں خطا اوسان اُسکے، اس کا کیا اِمکان ہے

(۴)

جب جہاز آتے ہیں پاس اس کے اڑاتے بادباں　　دیکھکر اہل جہاز اس کی دلیری کا سماں
کہتے ہیں: اللہ رے بگلے! تیری عالی ہمتی　　ہے سدا خونخوار لہروں کو سمجھتا سرسری
ایسا تو منجدھار میں رہتا ہے محوِ خوابِ ناز　　جیسے لنگر زن ہو ساحل کے قریں کوئی جہاز

(۵)

جب سمندر نیلگوں ہو، اور ہوا ہو خوشگوار　　آسماں سر پر ہو ساکن اور مطلع بے غبار
پاؤں پھیلاتا ہے وہ اس طرح سطح آب پر　　جیسے شہزادہ کوئی لیٹا ہو فرش خواب پر

(۶)

جب ہوائے تند سے ہوتا ہے پانی موجزن　　کھیلتی لہریں سمندر کی ہیں طوفاں تا گگن
مچھلیاں گھبرا کے جاتی ہیں نکل گرداب سے　　بگلے اٹھتے ہیں مگر لہرا کے سطح آب سے
ہو کے خوش چکر لگاتے ہیں ہوا میں بار بار　　چیختے پھرتے ہیں وہ چاروں طرف دیوانہ وار
سائیں سائیں کر رہی ہے گرچہ طوفاں کی ہوا　　مثل بادل کے گرجتا ہے سمندر برملا
اب مناتا خیر ہے ہر ایک اپنی جان کی　　پر انھیں دیکھو ذرا پروا نہیں طوفان کی،

(۷)

اس میں کیا شک ہو کہ بگلا ہے بہادر اور دلیر　　زندگی اپنی سدا طوفان میں کرتا ہے ٹیر
تند خو امواج کی گردن پہ رہتا ہے سوار　　آندھیوں کی ٹکریں ہیں جھیلتا لیل و نہار

(۸)

وہ جہاز، انساں کو جن پر ہے نہایت فخر و ناز
جن سے اُس کی طاقت و جرأت کا کھلتا ہے راز

چیرتے جاتے ہیں جو پانی میں بے خوف و خطر
جن پہ فوجیں جنگ کی خاطر سے کرتی ہیں سفر

جب ذرا موجوں میں ہوتی ہے ہوا سے ریل پیل
اُن کو طوفاں جانب گرداب دیتا ہے دھکیل

پاؤں ہیں مستوں کے جیسے لڑکھڑاتے بار بار
ہیں لڑھکتے اس طرح پانی پہ وہ بے اختیار

بادلوں میں جھاگ کے ہوتے ہیں پنہاں دمبدم
شور اُٹھتا ہے کہ "لو اب ڈوبتے جاتے ہیں ہم"

سُن کے یہ شور و فغاں آتی ہے بگلے کو ہنسی
طعن کرتا ہے جب اُن کی دیکھتا ہے بے بسی

کیوں نہ ہو مغرور بگلا، ہے وہ طوفاں سے نڈر
اُس کو موجوں کی نہ پروا ہے، نہ آندھی کا خطر

جس طرح گھوڑے پہ ہو آسن جمائے شہسوار
اس طرح پانی کی لہروں پر ہے اُس کو اختیار

(۹)

آشیاں ساحل پہ وہ اپنا بناتا ہے کبھی
اور خشکی کی طرف بھی اُڑ کے جاتا ہے کبھی

ہے سمندر پر مگر رہنا سدا اس کو پسند
شور رہتا ہے قیامت کا جہاں ہر دم بلند،

جھاگ اُٹھتے ہیں جہاں، گرداب پڑتے ہیں جہاں
ڈوبتی ہیں کشتیاں اور ٹوٹتے ہیں بادباں

(۱۰)

اس کو سردی کی نہ پروا ہے، نہ ویرانی کا ڈر
بے تکلف ایسے ملکوں کا وہ کرتا ہے سفر،

آدمی یا جانور کا ہے جہاں کمتر گذر   برف کے تودے برستے ہیں جہاں شام و سحر
برف میں ڈوبی ہوئی رہتی چٹانیں ہیں جہاں   ہے جہاں تخ بستہ پانی اور سورج ہے نہاں
واں بھی رہتا ہے اسی آسودگی سے صبح و شام،   جس طرح اس کا سمندر کے کنارے تھا مقام
ویل یا دریائی گھوڑے مرتے رہتے ہیں، وہاں   ہے یہ بگلے کے لئے سامان دعوت بیکراں
برف میں ہو یا سمندر میں، سدا دل شاد ہے   فکر سے روزی کی بگلا، ہر طرح آزاد ہے

(۱۱)

ولولے جو دل میں ہیں بگلے کے اٹھتے صبح و شام   جب وہ انسانوں کے دل میں اپنا کرتے ہیں مقام
وہ بھی بے خوف و خطر ملکوں میں جاتے ہیں نکل   ہمتوں میں اُن کی خاطر سے نہیں آتا خلل،
ہر مصیبت میں وہ سینے اپنے کرتے ہیں سپر   کوئی خطرہ ہو، نہیں کرتے ذرا اس سے خطر
ہر جگہ، ہر وقت، ہر حالت میں رہتے ہیں جری   حادثوں کو دہر کے وہ جانتے ہیں سرسری
ہے یہی وہ چیز جس پر ہے ترقی کی بنا،   جس میں یہ عادت نہیں کب وہ قوم ہوتی ہے فنا،
آؤ اب بگلے سے جوانمردی کا سیکھیں کام ہم   اپنی قسمت کو کریں ہمت سے اپنی رام ہم
آفتیں جھیلیں، رہیں محنت سے ہم تا آشنا   کام سے ہوں آشنا، آرام سے نا آشنا
نفس سرکش کو دبانے کی یہی تدبیر ہے   ورنہ کرنا رام اس توسن کو ٹیڑھی کھیر ہے
نفس امارہ کو جب قابو میں ہم لے آئیں گے   محنتوں کے ہو کے خوگر راحتیں ہم پائیں گے

رفتہ رفتہ ہوں گی آساں مشکلوں پہ مشکلیں   طے کریں گے رات دن ہم منزلوں پہ منزلیں

کامیابی کا یونہی بس کرتے کرتے انتظار

شاہدِ مقصد سے ہم اک روز ہوں گے ہمکنار۔

(رسالہ "معارف" پانی پت ستمبر ۱۹۰۱ء جلد ۴ نمبر ۹ صفحہ ۲۹۲-۲۹۲)

دیکھ رنگا رنگ پھولوں کی چمن آرائیاں"!

بن بے نشانِ کبریائی! تیری بے پروائیاں
تیری نادانیاں ہیں، ڈوبتی دانائیاں

ایک ہی جلوے سے اُس کے جل اُٹھے شمسی نظام
حُسنِ عالم سوز کی، دیکھو یہ بے پروائیاں

نزع میں ہیں دم رگیں کھنچنے لگیں گی غافلو!
یاد آئیں گی خمارِ عیش کی انگڑائیاں

حضرتِ عشق ایک دن آنکلے بزمِ علم میں
مُسکرائے دیکھ کر عقلوں کی رزم آرائیاں

موسمِ گل کی ہوا نے اُن کی آنکھیں کھولدیں
خاک کے گہوارے میں سوتی تھیں جو رعنائیاں

چشمِ بینا ایک بھی آئی نہ عالم میں نظر
جستجو میں گرچہ دوڑیں ہر طرف بینائیاں

سر سے تا پا ہے تو اے بُت! مظہرِ شانِ خدا!
تیری خاموشی کو سجدے کرتی ہیں گویائیاں

دیکھنے ہیں معجزے سورج کی کرنوں کے اگر
دیکھ رنگا رنگ پھولوں کی چمن پیرائیاں

دیدۂ خلوت پرست! انجم کا شکوہ ہے عبث
عرش کے اُس پار بھی ملتی نہیں تنہائیاں

اِن کو بادل کے ورق پر کھینچنی ہے کس کی شکل
بجلیاں کرتی ہیں کیوں پہروں قلم فرسائیاں

دوستی کے سُر تھے اُن کے، دشمنی پھیلی مگر،
جو بجائیں تو نے اے حُبِّ وطن شہنائیاں

دھان کے ہیں کھیت، یا نازک حسینوں کے پرے
رنگ کی شادابیاں ہیں حُسن کی سرسائیاں

قوم جو ڈوبی اُبھر کر پھر نہ آئی سطح پر
تجھ میں ہیں اے بحرِ غفلت! کس قدر گہرائیاں

("زمانہ" نومبر ۱۹۲۶ء صفحہ ۳۰۵)

"بھر دو جذبات کی مے عُمر کے پیمانے میں"

اس قدر تُند بھری ہے مرے پیمانے میں
کہ چھڑک دوں تو لگے آگ ابھی میخانے میں

ساری اِن خاک کے پُتلوں میں خدا نے بھر دیں
قدرتیں جتنی تھیں قدرت کے نہاں خانے میں

تم کبھی نرم مزاجی پہ ستمگر کی نہ جاؤ
پنجہ فولاد کا مخمل کے ہے دستانے میں

دل میں قوت جو اُبھرنے کی ہے بیکار نہ جائے
ایک پودا ہے پھبکتا ہوا اس دانے میں

شمع کے گرد یہ کیوں جوش سے کرتا ہے طواف
ناچتی پھرتی ہے کیا چیز یہ پروانے میں

آندھیاں آ کے سُناتی ہیں ترانے مجھ کو
بجلیاں رقص ہیں کرتی مرے کاشانے میں

عقل کو چاہیے سجدے کرے پیہم اُس کو
شان وحشت کی جو دیکھی ترے دیوانے میں

وہ بھی ہوگا اسی جھرمٹ میں ذرا غور سے دیکھ
پُتلے جو حُسن کے ہیں دل کے صنم خانے میں

فتنے اُٹھ اُٹھ کے تری بزم میں سو جاتے ہیں
کس قیامت کا اثر ہے مرے افسانے میں

حالِ دل کہنے کو ہوں اُن سے میں اے جذبۂ دل!
بجلیاں کوٹ کے بھر دے مرے افسانے میں

تاکہ باقی نہ رہے ہستی و مستی میں تمیز
بھر دو جذبات کی مے عُمر کے پیمانے میں

شہر تیں ہیں مری گمنامی کے اندر پنہاں
یعنی آبادیاں گُم ہیں اِسی ویرانے میں

("معارف" اعظم گڈھ۔ جولائی ۱۹۲۳ء جلد ۱۲ نمبر ۱ صفحہ ۶۸-۶۹)

"کاسۂ مزدور بھی اب جامِ جم ہونے کو ہے"

داستانِ رنگینیِ دل کی رقم ہونے کو ہے / پھر تصورِ رونقِ باغِ ارم ہونے کو ہے
دل میں حسنِ بے نشاں کو جلوہ گر پاتا ہوں میں / مختصر اب قصۂ دیر و حرم ہونے کو ہے
نغمۂ خاموش چھیڑا کس نے دل کی بزم میں / دین و دنیا کا نہاں آں زیر و بم ہونے کو ہے
سبزۂ بیگانہ بن کر پھر زمیں سے سر نکال / گرچہ ہستی تیری پامالِ ستم ہونے کو ہے
نشۂ سرمایہ داری کیوں نہ ہو جائے ہرن / کاسۂ مزدور بھی اب جامِ جم ہونے کو ہے
دیدۂ بیدار پر کیوں تجھ کو اے شبنم ہے ناز / تیری ہستی مائلِ خوابِ عدم ہونے کو ہے
شیخ کے دل میں جو چنگاری ہوس کی جا پڑی / خرمنِ ایماں بھی اب جل کر بھسم ہونے کو ہے
ہر تمنا از سرِ نو فتنہ زا ہونے لگی / دل میں سامانِ قیامت پھر بہم ہونے کو ہے
کس بلندی پر مجھے پہنچا یا جذبِ عشق نے / اب فضائے لامکاں زیرِ قدم ہونے کو ہے
ہاتھ ملتے میں نے گلچیں کو کبھی دیکھا نہ تھا / کس کی شاخِ آرزو یا رب قلم ہونے کو ہے

عقل کے جو مرحب و عنتر ہیں، کیوں لرزہ میں ہیں
ذوالفقارِ عشق شاید پھر علم ہونے کو ہے

("زمانہ" اگست سنہ ۱۹۲۷ء ص ۱۱۰)

"مرے تلخابۂ غم میں ڈبو دو آبِ حیوان کو"

گریباں سے ترے کس نے نکالا صبحِ خنداں کو
کیا کس نے نہاں دامن کی کلیوں میں گلستان کو

اُڑایا چٹکیوں میں میرے ذرے نے بیاباں کو
مرے قطرے نے پانی کر دیا ہر موجِ طوفان کو

دیئے ہیں کھول دفتر زندگی کے تیرے غمزوں نے
دیا تھا چھیڑ یہ کس نے تری چشمِ سخندان کو

مری کشتی بھنور سے کھیلنے کا شوق رکھتی ہے
یہ کس نے کر دیا خاموش ہا یا ربِ موجِ طوفان کو

یہ کیا نغمہ تھا، چھیڑا جو یکایک قلبِ مضطر نے
کہ میری نَے نے رقصاں کر دیا سارے گلستان کو

میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ چمکا تیرے پرتو سے
لگی ہیں کھینچنے کرنیں مری مہرِ درخشان کو

نہ کرتی تو اگر بر وقت اے اُلفت! مسیحائی
لپیٹا تھا کفن میں عقل نے جذباتِ انساں کو

مرے گوہر کو ڈھالا کس صدف نے اپنے سانچے میں
کہ میری آب ہر دم سینچتی ہے ابر نیساں کو

ترے دل میں ہے تاریکی تو پھر لاکھوں ستارے بھی
نہ روشن کر سکیں گے اے جواں! تیری شبستاں کو

ہر اک افسردہ دل میں پھونک دوں گا روح بیداری
ذرا کروٹ بدلنے دو مرے خوابیدہ ارماں کو

مرے ذوقِ فنا پر زندگی ہے خضر کی شرماں
مرے تلخابۂ غم میں ڈبو دو آبِ حیواں کو

محبت کی کشش کی داستاں پوچھو زلیخا سے
نکالا چاہِ کنعاں سے اُسی نے ماہِ کنعاں کو

تری صنعت پہ میں اے موسمِ گل کیوں نہ حیراں ہوں
لپیٹا ہے لباسِ رنگ میں کس حسنِ عریاں کو

بھرا افسردگی سے ہے جو کنجِ آشیاں میرا

فلک پر ڈھونڈتی ہیں میری آنکھیں برقِ خنداں کو
مجازی حسن کے پھولوں کو حیرت سے رہا تکتا
نہ سمجھا میں حقیقت کے تبسم ہائے پنہاں کو
بہاریں بوسہ دیں خاکِ لحد کو تیری اے سعدی
ترے خونِ جگر نے کر دیا رنگیں گلستاں کو
بہت منصور ہیں جو دار پر چڑھنے کے شائق ہیں
بہت یوسف ہیں اب جو ڈھونڈتے پھرتے ہیں زنداں کو
مری بیکار ہستی ہے تری زینت کا سرمایہ
بنا کر دیکھ زلف اپنی، مرے بختِ پریشاں کو
دکھاتا ہوں نظارے اپنے دل کو دین و دُنیا کے
کھلونے دے کے بہلاتا ہوں میں اس طفلِ ناداں کو
جھجکتا ہے اگر جلوت سے، آ خلوت میں بے پردہ
تھپک کر میں سُلا دیتا ہوں ساری بزمِ امکاں کو
مری پروازِ فکر اے فقر ہو اتنی بلندی پر
کہ دفنا دوں خوشی سے خاک میں تختِ سلیماں کو

میں اس حسنِ لطافت بیز کا شیدا ہوں اے زاہد!
سمجھ کر گردِ جو دامن سے جھاڑے باغِ رضواں کو

کلیمِ طورِ معنیٰ ہوں - یدِ بیضا ہے میرا دل
منوّر کر دیا جس نے مرے چاکِ گریباں کو

("الناظر" اگست ۱۹۲۶ء جلد ۲۱ نمبر ۲ صفحہ ۵۰)

شاہ راہِ عمل

درِ حق پر جھکا سر، دل میں اطمینان پیدا کر
حوادث سے نہ جو لیسپا ہو، وہ ایمان پیدا کر
مہیا کر وہ آنکھیں، جن سے دیکھے جلوۂ صانع
سُنے فطرت کے نغمے جن سے تو وہ کان پیدا کر
نظر کے سامنے جلوے نئے آنے کو ہیں اے دل
ذرا جنبش میں آ، اور پھر نئے ارمان پیدا کر
تری ہستی کے ذرے گر بکھر جائیں تو کیا پروا
لڑی خورشید سے آنکھیں رہیں، وہ آن پیدا کر
دمِ خنجر پہ تیرے سینہ رکھ دوں اپنا اے قاتل!
مرے سینہ میں وہ جذبہ ترے قربان پیدا کر
گرائے حُسنِ بے پروا، ہزاروں بجلیاں، لیکن
رہے مضطر جو شوقِ دید میں، وہ جان پیدا کر
قیامت کا سماں گر دیکھنا ہے اے جواں تجھ کو

تو دل کے ولولوں میں شوق سے ہیجان پیدا کر

حجابِ اکبر آگے دیدۂ تر کے نہ کر برپا

نہ دانائی سے رسم و راہ لے نادان پیدا کر

فضائے زہد ہے تنگ اے فضائے عشق سو غافل!

جہاں دوڑیں اُمنگیں دل کی وہ میدان پیدا کر

فلک کی گردشوں کی زد سے جائے گا نکل باہر

جنونِ عشق سے سر میں ذرا دوران پیدا کر

حقیقت کی کرن پڑتی نہیں باطل بھرے دل پر

اندھیرا گھر میں ہے تو کوئی روشندان پیدا کر

غنیمت جان، اے محوِ تمنا! عیشِ حاضر کو

نہ دل میں فکرِ فردا سے کوئی خلجان پیدا کر

مکرر یہ تماشے زندگی کے اے خدا کب تک؟

نئی دنیا بسا اب، اور نئے انسان پیدا کر

("الناظر" فروری ۱۹۲۵ء جلد ۲۸ نمبر ۲ صفحہ ۱۶۴-۳۹)

نونہالوں کی موت

(۱)

قدرت نے لگایا ہے ۔۔ اک باغ طرب افزا
میووں سے لدی شاخیں ۔۔ ہیں جھومتی یاں ہر جا
پودوں میں وہ سرسبزی ۔۔ قدرت نے عیاں کی ہے
جن پر کہ نظر پڑتی ۔۔ ہر اہل جہاں کی ہے،

(۲)

ناگاہ فرشتہ اک ۔۔ ہوتا ہے یہاں داخل
جس طرح کسی گھر میں ۔۔ ہو سیل رواں داخل
خوں اُس کی نگاہوں سے ۔۔ ہر لحظہ ٹپکتا ہے
ہے ہاتھ میں جو چاقو ۔۔ بجلی سا چمکتا ہے
ہے کاٹتا اک دم وہ ۔۔ سرسبز نہالوں کو
رحم اُن پہ نہ کیوں آئے ۔۔ سب دیکھنے والوں کو

میووں سے لدی شاخیں — پودوں سے جدا کر کے
لے جاتا ہے اور خوش ہو — یہ جور و جفا کر کے

(۳)

اک دن یہ فرشتے نے — سوچا کہ مرا اچھا تو
میووں کے درختوں کے — کرتا ہے خدا بازو
پتوں سے مگر چھپ کر — جو پھول مہکتے ہیں
پھندے سے مرے بچ کر — کیا کیا نہ نکھر سکتے ہیں
یہ سچ ہے کہ حسن ان پر — اک نور ہے برساتا
جب سانس یہ لیتے ہیں — گلشن ہے مہک جاتا

(۴)

پھولوں ہی کے دم سے ہے — اس باغ کی آبادی
گاتے ہیں مگن ہو کر — یہ نغمۂ آزادی
شبنم کے مگر آنسو — ہر صبح بہاتے ہیں
چاک اپنے گریباں کا — گلچیں کو دکھاتے ہیں
لازم ہے کہ پاس اس کے — میں جاؤں انھیں لے کر

یہ جس کی جدائی میں ــــ رہتے ہیں سدا مضطر

(۵)

یہ کہہ کے فرشتے نے ــــ غنچوں پہ نظر ڈالی
افسوس کیا، لیکن ــــ دل رحم سے تھا خالی
منہ بند جو تھیں کلیاں ــــ چاقو سے اُنھیں کاٹا
دیکھ اُس کی یہ بیدردی ــــ تھا باغ میں سنّاٹا
دامن میں سمیٹ اُس نے ــــ غنچے وہ لئے سارے
پھر ہنس کے کہا، کیوں ہیں ــــ افسردہ یہ بیچارے

۶

لے جاؤں گا میں اُن کو ــــ مالک کی حضوری میں
ہر صبح یہ روتے ہیں ــــ جس کے غم دوری میں
ہیں غنچہ و گل اس کے ــــ ہیں اُس کے چمن سارے
اُلفت میں اُسی کی ہیں ــــ پودے یہ نگن سارے
پھولوں کا ہر اِک پودا ــــ خوش ہوگا وہاں جا کر
پھولیں گے پھلیں گے سب ــــ جنّت کی ہوا پا کر

جب ڈوب کے اُبھریں گے — یہ دودھ کی نہروں میں
پھول اُن کے نہائیں گے — سب نور کی لہروں میں
جنت میں جو ہیں رہیں — پاکیزہ و نورانی
ہیں پھول یہی، جن سے — زینت ہے انھیں پانی

(۷)

کہتے ہیں فرشتہ ہے — یہ موت کا پیغامی
پھولوں کو جو کرتا ہے — پامال بدانجامی
سرسبز نہالوں کو — جو کاٹتا پھرتا ہے
اِک برقِ بلا بن کر — جو باغ پہ گرتا ہے
ہے توڑتا آفت یہ — کھیتوں پہ، کسانوں پر
بے درد ہے نام اس کا — دُنیا کی زبانوں پر

(۸)

یہ سچ ہے، اگر جن کو — تھوڑی سی بصیرت ہو
یہ اُن کی نگاہوں میں — اِک قاصدِ رحمت ہے
یہ کاٹ کے جو پودے — اِس باغ سے ہے لیتا

فردوس کے باغوں میں — ہے سب کو لگا دینا
پروان چڑھیں گے یہ — جنت کی ہواؤں سے
خوراک یہ سب لیں گے — رحمت کی فضاؤں سے
کچھ روز مہکتے یہ، — دُنیا میں اگر رہتے
آتی جو خزاں اُن پر — پھر اُس کی جفاؤں سے
جنّت میں مگر ان پر — برسے گا سدا جوبن
کر سکتی نہیں اُن سے — کچھ بادِ خزاں اَن بن
یاں لائقِ عبرت ہے — ہستی ہے جو آج اُنکی
مالک کی نظر میں واں — بڑھ جائے گی لاج اُنکی

("الناظر" جلد ۲۴۔ نمبر ۱۴۱۔ مارچ ۱۹۲۳ء صفحہ ۲۱-۲۳)

انسان کا دل

دل بھی کیا شے ہے کہ بھولا بھی ہے عیار بھی ہے
خاکساری کا بھی رنگ اس میں ہے پندار بھی ہے

متحرک ہے کبھی، اور کبھی ساکن ہے
یعنی خاموش بھی ہے، مائلِ گفتار بھی ہے

کفر و اسلام کا اُس کے نہیں کھلتا عقدہ
ہاتھ میں سبحہ بھی ہے، دوش پہ زنار بھی ہے

مجلسِ عشق میں پاتا ہوں اُسے میں مدہوش
محفلِ عقل میں دیکھا، تو یہ ہشیار بھی ہے

تازگی چہرہ پہ اس کے ہے، اُداسی ہے کبھی
اس کے آغوش میں صحرا بھی ہے گلزار بھی ہے

کبھی حیدرؑ کا یہ پیرو ہے، کبھی مرحب کا
یعنی کرّار بھی ہے، اور یہ فرار بھی ہے

ہے بدی پر کبھی مائل، کبھی نیکی پہ فدا
اس کی فطرت میں نہاں نور بھی ہے نار بھی ہے

درد و درماں سے بنائی ہے بہم اس کی سرشت
آپ یہ اپنا مسیحا بھی ہے، بیمار بھی ہے

کعبہ میں اس کو حقیقت کا شناسا پایا
صنمستاں میں یہ باطل کا پرستار بھی ہے

اس کی فطرت وہ سمندر ہے کہ جس میں پنہاں
موجِ اقبال بھی ہے، ورطۂ ادبار بھی ہے

زاہدی کا اثرِ سجدہ ہے پیشانی پر
عاشقی کی مئے گلرنگ سے سرشار بھی ہے

اس کی ہستی کہ ہے معجونِ عتاب و الطاف
ابرِ دُر ریز بھی ہے، برقِ شرربار بھی ہے

بربریت کا، ہلاکت کا فرشتہ بھی ہے یہ　　قصر وایوانِ تمدّن کا یہ معمار بھی ہے
ہے کبھی اہلِ تحکّم کے چمن کا گل چیں　　کبھی احرار کا یہ طرّۂ دستار بھی ہے
کبھی عصیاں سے گریزاں، کبھی طاعت سے نفور　　مستحقِ خُلد کا، دوزخ کا سزاوار بھی ہے
ناز پر ہے کبھی آمادہ، کبھی گرمِ نیاز　　بے خبر اپنی خودی سے ہے خبردار بھی ہے
آنکھ باہر کی جو ہے نیند میں رہتی ہے مگن　　اس کے اندر مگر اک دیدۂ بیدار بھی ہے
مدعیِ عشقِ حقیقی کا یہ رہتا ہے، مگر　　دولتِ حُسنِ مجازی کا خریدار بھی ہے
معبدِ امن میں کرتا ہے یہ سجدے پیہم　　ساحتِ جنگ میں آمادۂ پیکار بھی ہے

الغرض فلسفۂ زیست ہے اُس کا مبہم
یہ وہ زندہ ہے، کہ مجبور بھی مختار بھی ہے

("قوس قزح" سالانہ نمبر ۱۹۲۷ء صفحہ ۱۰۸)

انسان کی تازہ کاریاں

(۱)

پیدا ہوا ہے جب سے جہاں ، ہے اسی طرح — انجم کا یہ نظام رواں ہے اسی طرح
کھلتے ہیں پھول ، جھڑتے ہیں مرجھا کے بارہا — نیرنگیٔ بہار و خزاں ہے اسی طرح
آتا ہے ابر ، اور برستا ہے جا بجا — رقصاں فلک پہ برقِ تپاں ہے اسی طرح
ساحل خموش عالمِ حیرت میں اب بھی ہے — طوفانِ بحر گرمِ فغاں ہے اسی طرح
شہباز اسی طرح ہے کبوتر کی گھات میں — آہو شکارِ شیرِ ژیاں ہے اسی طرح
چشمہ شگافِ کوہ سے اب بھی ہے موجزن — پتھر کے دل میں آگ نہاں ہے اسی طرح
مائل ہے اب بھی سیل رواں جانبِ نشیب — اُٹھتا ہوا یہ اب بھی دھواں ہے اسی طرح

ہر شے دم اپنے شیوۂ پیشیں کا بھرتی ہے
جو کام کر چکی ہے ، وُہی اب بھی کرتی ہے

(۲)

انسان کی سرشت ، مگر بے قرار ہے — اک حال پر ثبات اُسے ناگوار ہے

جدت پسندی اُس کی طبیعت کا ہے شعار — ہر دم خیالِ نو سے دل اُس کا دوچار ہے
وُسعت کو بحر و بر کی وہ پامال کر چکا — محکوم اُس کی قوتِ برق و بخار ہے
اُس کا خیال عرش سے آگے نکل گیا — اُس کی نظر نجومِ درخشاں سے پار ہے
بزموں میں اُس کی شانِ جمالی ہے جلوہ گر — رزموں میں اُس کی شانِ جلال آشکار ہے
دل اُس کا دیکھئے تو کہو تازہ فکر اُسے — ہاتھ اُس کا دیکھئے تو سدا تازہ کار ہے
مرضی سے اپنی چاہے یہ جس شے کو دے بدل — قدرت کی طاقتوں پہ اُسے اختیار ہے

جب سوچو، اُس کی دُھن ہے نئی آن ہے نئی
جب دیکھو، اُس کا جلوہ نیا، شان ہے نئی

(سالنامہ نیرنگِ خیال ۱۹۲۸ء۔ صفحہ ۱۲۴)

جذباتِ لطیفہ

پیشِ نظر اک شوخ حسین وقتِ سحر تھا — سورج کی کرن تھی کہ مرا تابِ نظر تھا
ہنگامہ قیامت کا تھا، یا دردِ جگر تھا — عالم جو تمنّا کا تھا، سب زیر و زبر تھا
کل ہم نے جو تعمیر کیا قصرِ تمنّا — آج اُس کو جو دیکھا تو وہ سنسان کھنڈر تھا
دیکھا تھا کنکھیوں سے کل اک روئے حسیں کو — پھولوں سے بھرا گوشۂ دامانِ نظر تھا
طوفان سے بچ سکتی نہ تھی عقل کی کشتی — جذبات کا سینہ میں مرے ایک بھنور تھا
کچھ زمزمے میں طائرِ سدرہ کو سکھاتا — پر سدرہ سے آگے ہی مرا عزمِ سفر تھا
پہنچا ترے کوچہ سے وہ خورشید کے سر پر — جو ذرّہ کہ پامالِ سرِ راہگذر تھا
دیدا اپنی ہوئی شانِ رحمت کو جو منظور — اس کے لئے آئینہ مرا دامنِ تر تھا
پیری کو سمجھتا ہوں میں خاکسترِ ایام — جو عہدِ جوانی تھا وہ اک رقصِ شرر تھا
دی عجز نے جب دستِ دعا کو مرے تحریک — چٹکی میں مری گوشۂ دامانِ اثر تھا
آتش کدۂ رنگِ شفق نام ہے جس کا — وہ صبح کے پردے میں مرا سوزِ جگر تھا
درکار تھے مضمونِ بلند اُس کو جو کل رات — زانوئے ثریّا پہ مری فکر کا سر تھا

کیوں دیکھ کے اس جلوے کو تو رہ گئی تجھ کر
کیا تو بھی چراغ سحر اے نورِ سحر تھا

اے عشق تری تیغ سے گھائل ہیں ملک بھی
اک دل ہی بشر کا تھا جو یوں سینہ سپر تھا

ٹوٹا ہوا دل میرا وہ آئینہ تھا ہمدم!
خود جلوہ نما جس میں کبھی آئینہ گر تھا

بچ سکتا نہ تھا خرمنِ ہستی کبھی اُس کا
سینے میں دبا جس کے محبت کا شرر تھا

پھولا پھلا اُس وقت مرا نخلِ تمنا
اے بادِ خزاں جب ترے جھونکوں کا خطر تھا

میں زندۂ جاوید ہوں، مر سکتا ہوں کیونکر؟
پانی ترا اے بحرِ فنا! تا بہ کمر تھا

دیکھا تجھے اے حسنِ ازل دور سے ورنہ
میں حسنِ بشر دیکھ کے کوتاہ نظر تھا

ذرّوں کی طرح رقص کناں تھے مرے جذبات
جب روزنِ دل میں تری کرنوں کا گذر تھا

(رسالہ "قوسِ قزح" لاہور۔ دسمبر ۱۹۲۶ء)

شکوۂ دل

کیوں بحرِ زندگی میں در آتا نہیں کوئی — کیوں غوطہ اس کی موج میں کھاتا نہیں کوئی

کیوں ہر جواں کے چہرے پہ چھائی ہے مُردنی — کیوں اپنے "قُم" سے اُن کو جگاتا نہیں کوئی

جاتی ہے رائگاں یہ تگ و دوِ نسیم کی — پھولوں میں پیرہن کو بساتا نہیں کوئی

کرنیں ہیں آفتابِ کرم کی اگرچہ تیز — لعل اپنے سنگِ دل کو بناتا نہیں کوئی

چاہے اگر تو وقت ہے یہ سرخ روئی کا — بیڑہ مگر مُہم کا اُٹھاتا نہیں کوئی

بازو میں زور، تیر مُہیّا، کماں درست — حیرت ہے کیوں نشانہ اُڑاتا نہیں کوئی

ساقی کریم، بادہ کہن، مہرباں حریف — ساغر تک اپنا ہاتھ بڑھاتا نہیں کوئی

حسن اپنا جلوہ گرچہ دکھاتا ہے بے دریغ — فرصت مگر نظارے کی پاتا نہیں کوئی

جانیں لبوں پہ ہیں، مگر اللہ رے بے دلی — آبِ بقا کے چشمے پہ جاتا نہیں کوئی

گھر پھونس کا ہے، اور ہیں جھونکے ہوا کے تند — پانی چھڑک کے آگ بجھاتا نہیں کوئی

کہنے کو شہسوار ہیں، گھڑ دوڑ ہیں، مگر — جولانیاں ہنر کی دکھاتا نہیں کوئی

آئینہ زنگ خوردہ، ہر اک کی بغل میں ہے — صیقل گروں کے سامنے لاتا نہیں کوئی

شکوہ ہے دردِ دل کا ہر اک کی زبان پر
افسانہ چارہ گر کو سُناتا نہیں کوئی

کہتے ہیں یہ کہ شیر سے پنجہ لڑائیں گے
آنکھیں غزال سے بھی لڑاتا نہیں کوئی

کہتے ہیں انجمن کو مُنوّر کریں گے ہم
لَو اپنی سوزِ دل سے لگاتا نہیں کوئی

ہے پہلے پار اُترنے پہ جھگڑا ہر ایک سے
موجوں میں ہاتھ پاؤں ہلاتا نہیں کوئی

(رسالہ "عالمگیر" اپریل و مئی ۱۹۲۷ء)

فطریات

گرد اسے کبھی آنکھیں وہ جھپک جاتی ہیں — ہر طرف نور کی کرنیں سی لپک جاتی ہیں
فلسفی جب ترے رازوں کا لگاتے ہیں سراغ — دانشیں عجز کے گوشوں میں اٹک جاتی ہیں
دے وہ صہبائے درخشاں مجھے ساقی جس سے — آنکھیں افلاک کے تاروں کی جھپک جاتی ہیں
تیرے جلوے کی طلب میں ہے دلوں کو حیرت — جستجوئیں اسی منزل میں ٹھٹک جاتی ہیں
اہلِ دولت کبھی گر ہوش میں آنا چاہیں — غفلتیں پھر انہیں چپ چاپ تھپک جاتی ہیں
اتنی دوری و بلندی پہ ہے مسکن تیرا — جس میں پروازیں ملائک کی بھی تھک جاتی ہیں
جب حسینانِ تخیل کا ہے چڑھتا جوبن — چولیاں جامۂ لفظی کی مسک جاتی ہیں
بیٹھ جاتی ہے اگر ہجر میں کچھ گردِ ملال — دامنِ دل کو تمنائیں جھٹک جاتی ہیں
دانشیں تیرے اک افسانہ سے غافل ہیں پڑی — بینشیں تیرے اک افسوں سے لپک جاتی ہیں
سرسراتی ہے اگر جذبۂ الفت کی ہوا — دل کی چنگاریاں اک بار دہک جاتی ہیں
ضعف میں میری تمناؤں کا انجام ہے یہ — بن کے آنسو مری پلکوں سے ڈھلک جاتی ہیں
رحمتیں جب تری ہوتی ہیں کسی جا نازل — زحمتیں پہلے ہی چپ چاپ سٹک جاتی ہیں

محنت و صبر سے ہوں گی وہ مہمیں پوری
ہمتیں جن کے تصور سے جھجک جاتی ہیں

نرم نرم آکے جو ٹکراتی ہیں لہریں پیہم
لب دریا سے چٹانیں بھی سرک جاتی ہیں

تیری دُھن وہ ہے کہ ہر شے کو بھلا دیتی ہے
یادیں اس بھول بھلیاں میں بھٹک جاتی ہیں

آپ کے صاعقۂ ناز کا رہتا ہے خطر
کھیتیاں اہل تمنا کی جو پک جاتی ہیں

نخوتیں بن کے ندامت کا عرق در پہ ترے
اہل سطوت کی جبینوں سے ٹپک جاتی ہیں

وہ ہیں پردے میں تو پردہ تجھے کیا اے گلچیں
اُن کی رعنائیاں پھولوں میں جھلک جاتی ہیں

بُغض کی آگ بھڑکتی ہے جو محکوموں میں
قسمتیں اہل حکومت کی چمک جاتی ہیں

جب ندامت کی ہواؤں کا گذر ہوتا ہے
پھول پر دل کے وہ شبنم سی چھڑک جاتی ہیں

جن کو ہے جوئے تعیش نے بنایا نازک
بار غم سے کمریں اُن کی لچک جاتی ہیں

رہنما عطر شرافت سے معطر ہوں اگر
قوم کی انجمنیں اُن سے مہک جاتی ہیں

دین و دُنیا کا نہیں ہوش دلوں کو رہتا
فرصتیں یاد سے جب تیری جھلک جاتی ہیں

(از رسالہ "مرقع ادب" انبالہ شہر۔ مارچ ۱۹۲۷ء)

پیغامِ حیات

(۱)

کیا اپنے بزرگوں کا چلن بھول گئے تم — اسلام کا وہ عہدِ کہن بھول گئے تم
کیا زمزمۂ حبِ وطن بھول گئے تم — ملت سے وہ الفت کی لگن بھول گئے تم
کیا اپنی ترقی کے جتن بھول گئے تم — تبلیغ شریعت کا مشن بھول گئے تم

(۲)

اللہ نے اسلام کی نعمت تمھیں دی ہے — زحمت ہو تو رحمت کی بشارت تمھیں دی ہے
گلفت ہو تو الفت کی اجازت تمھیں دی ہے — بگڑے ہو تو بننے کی ہدایت تمھیں دی ہے
بکھرے ہو تو تنظیم کی عزت تمھیں دی ہے — ٹھنڈے ہو تو ایماں کی حرارت تمھیں دی ہے

(۳)

ذرے ہو تو جم جاؤ کہ صحرا نظر آئے — قطرے ہو تو مل جاؤ کہ دریا نظر آئے
بکھرے ہو تو سمٹو کہ تماشا نظر آئے — تاروں بھرے افلاک کا نقشا نظر آئے
جو نقش تمھارا ہو وہ جمتا نظر آئے — جو بول تمھارا ہو، وہ بالا نظر آئے

(۴)

جو حرف ہوں بکھرے انھیں تحریر بنا دو   ٹوٹی ہوں جو کڑیاں انھیں زنجیر بنا دو
تخریب کے آثار کو تعمیر بنا دو   ظلمت کی ہر اک موج کو تنویر بنا دو
ذلت کو بدل دو اُسے توقیر بنا دو   جو دھات ہے کھوٹی اُسے اکسیر بنا دو

(۵)

فرزند ہو تم ملتِ ذی شان کے اُٹھو   ملت کا ہے جو فرض اُسے پہچان کے اُٹھو
اللہ کا جو حق ہے اُسے جان کے اُٹھو   جو حکم پیمبر ہے اُسے مان کے اُٹھو
دامن کو ذرا عزم کے گردان کے اُٹھو   جو دل میں ارادہ ہے اُسی ٹھان کے اُٹھو

(۶)

چڑھتے ہوئے دریائے خطر سے ہے اُترنا   طوفانِ حوادث کے تھپیڑوں سے نہ ڈرنا
چوٹوں سے تمھیں دستِ قضا کی ہے گزرنا   دب دب کے پڑے گا تمھیں ہر بار اُبھرنا
گرماؤ جو غیرت سے تو ہرگز نہ ٹھٹھرنا   اُلفت سے جو سمٹو تو سمٹ کر نہ بکھرنا

(رسالہ "تنظیم" امرتسر مئی ۱۹۲۸ء)

تابشِ حسن

کرتا ہوں تیرے حسن سے روشن نظر کو میں
لاتا ہوں کب خیال میں شمس و قمر کو میں

آیا ہوں کوئے یار سے یہ چاہتا ہوں آج
بوسوں سے دوں چھپا قدمِ نامہ بر کو میں

کس دشت ہولناک میں رکھتا ہوں میں قدم
پاتا ابھی سے لرزہ میں ہوں راہبر کو میں

پہنچی نہ یہ کمند لبِ بام تک ترے
کیوں پھینک دوں نہ توڑ کے تارِ نظر کو میں

کندہ ہو تیرا نام اسی یاقوتِ سرخ پر
رکھوں نہ کیوں تراش کے لختِ جگر کو میں

آنکھیں نہ جل اٹھیں تری اس جلوہ گاہ میں
رکھتا ہوں پھونک پھونک کے پائے نظر کو میں

پرتو سے تیرے حسن کے قدر ان کی بڑھ گئی
کانٹوں میں تولتا ہوں ہر اک گل کے زر کو میں

جلوہ تمھارا کوئی گرفتار ہو نہ جائے
بچنا کہ پھینکتا ہوں کمندِ نظر کو میں

کہتی ہے تیغ تیز جوانانِ قوم سے
مدت سے ڈھونڈتی ہوں تمھاری کمر کو میں

روشن خیال جھڑتے ہیں میرے دماغ سے
چھلنی میں چھانتا ہوں فروغِ سحر کو میں

(رسالہ "عالمگیر" لاہور۔ دسمبر ۱۹۲۵ء)

صبح

روشن ہے تیرے عکس سے یہ جلوہ زارِ صبح
گُل چیں ترے چمن کی ہے گویا بہارِ صبح

میں تیرہ بخت تجھ سے جُدا اس طرح رہا
جس طرح شام ہو نہ سکی ہم کنارِ صبح

پیچھے ترے نہاں ہے وہ حُسنِ نظر گداز
ہٹ جا نظر کے سامنے سے اے غبارِ صبح

کس بادشاہِ حُسن کا لاتا ہے تو پیام
آتا ہے کس طرف سے تُو اے شہسوارِ صبح

یہ تُندمے ہے کس نے بھری جام مہر میں
اس راز کو بتائے گا کیا شیر خوارِ صبح

کیا نور کی پھوار سی پڑتی چمن میں ہے
گرتی کس آب و تاب سے ہے آبشارِ صبح

اے وہ کہ تیری ضَو سے ہیں کافور ظلمتیں
تجھ پر نثار صبح ہے، میں ہوں نثارِ صبح

شبنم میں جس کے جام کو رکھ کر کیا ہے سرد
ساقی! پلا مجھے وہ مئے خوشگوارِ صبح

پَرتَو ترے جمال کا بھی اس میں ہے شریک
سورج کی روشنی پہ نہیں ہے مدارِ صبح

(از "علی گڑھ میگزین")

وقتِ سحر

ہوتا ہے وقتِ صبح عجب نور کا سماں
جب نرم نرم سبزہ بدلتا ہے کروٹیں

ہر باغ میں طیورِ چمن کے وہ چہچہے
ہر دشت میں نسیم کی وہ سرسراہٹیں

وہ چرخِ سبز فام پہ کرنوں کا پھوٹنا
پانی میں نورِ صبح کی وہ جھلملاہٹیں

پانی کی چادروں کے وہ پرجوش زمزمے
گلہائے رنگ رنگ کی وہ مسکراہٹیں

موروں کا صحنِ باغ میں وہ رقصِ دلفریب
ہرنوں کی سبزہ زار میں وہ چلبلاہٹیں

وہ بلبلوں کا شاہدِ گل سے خطابِ عشق
وہ قمریوں کی سروِ چمن سے لگاوٹیں

وہ مندروں میں گھنٹیوں کا شورِ دلخراش
تسبیحِ زاہدانہ کی وہ گنگناہٹیں

(از "علی گڑھ میگزین")

خیابانِ حسن

دیکھ اُس نورِ تبسم کا نمایاں ہونا
دیکھ اس سینے کے گوشوں کا درخشاں ہونا

تیرے ہر ذرّے کا اِک مہرِ درخشاں ہونا
میرے ہر قطرے کا سرمایۂ طوفاں ہونا

تیرے ہر غمزے کا اک نشترِ عُریاں ہونا
میرے ہر درد کا اک جذبۂ پنہاں ہونا

دل تصوّر میں ترے حُسن کے ہے محوِ نشاط
سیکھتا ہے مرا گلدستۂ گلستاں ہونا

بیقراری مری دیتی ہے شبِ مہ میں سکھا
سطحِ دریا پہ ہر اک موج کو غلطاں ہونا

بعد مُردن جو کھلی آنکھ تو تسلیم کیا
ساری بیداری کا اک خوابِ پریشاں ہونا

میں نہیں چاہتا، گو چاہتی ہو بادِ بہار
تیرے اس حُسن کا رنگوں میں پریشاں ہونا

کہتے ہیں حُسن جسے، ہے وہ سمندر کی پری
چاہیئے اُس کے لئے شہپرِ طوفاں ہونا

ہالہ کیا چیز ہے، خود چاند کو واجب ہوگا
ہالہ بن بن کے ترے چہرے پہ قرباں ہونا

(رسالہ "عالمگیر" لاہور۔ نومبر ۱۹۲۶ء)

کلیدِ ظفر

دل آئینہ ہے، اس کو بگڑنے نہ دو کبھی
زد اس پہ فکر و رنج کی پڑنے نہ دو کبھی

خورشید کو بنا لیا جب مطمحِ نظر
ذرّات سے نگاہ کو لڑنے نہ دو کبھی

خالی نہ رکھو دل کو امنگوں سے غافلو!
اس شہرِ آرزو کو اجڑنے نہ دو کبھی

راہِ طلب میں آپ بنو اپنے دستگیر
ہاتھ اپنا خضر کو بھی پکڑنے نہ دو کبھی

عزت کی آب و تاب میں آنے نہ پائے فرق
اس چاند کو خسوف میں پڑنے نہ دو کبھی

دیتے رہو زمانے کی ہر چال کا جواب
نقشے کو زندگی کے بگڑنے نہ دو کبھی

قابو میں رکھو نفس کے سرکش سمند کو
آسن کو زینہار اکھڑنے نہ دو کبھی

راہِ طلب میں اپنے تئیں اے مہم وَرو
ہمت کے قافلے سے بچھڑنے نہ دو کبھی

کشتی لڑو زمانے کی ناکامیوں سے تم
غیرت کے ولولوں کو پچھڑنے نہ دو کبھی

دُھن میں اٹھو سفر کی جو مطلوب ہے ظفر
دامن سے گردِ راہ کو جھڑنے نہ دو کبھی

ناکامیوں کا راز چھپا ہے نفاق میں
باہم دل و زباں کو جھگڑنے نہ دو کبھی

("قوسِ قزح" لاہور۔ اپریل و مئی ۱۹۲۶ء)

مسرّت بھرا دل

دل مسرّت کی ہے منزل، اُسے ویراں نہ کرو
یہ گلستاں ہے، اِسے غم سے بیاباں نہ کرو
جذبۂ قہر سے کیوں اس پہ گراؤ بجلی،
جلوۂ مہر سے کیوں اس کو فروزاں نہ کرو
اُٹھنے دو زندہ امنگوں کی ترنگیں اُس میں
تم اُداسی سے اُسے شہرِ خموشاں نہ کرو
جلوہ گر شاہدِ امید کا ہے اُس میں جمال
ہے یہ کاشانۂ یوسف اسے زنداں نہ کرو
یاد ہیں اُس کو مسیحائی کے سارے انداز
درد کا اپنے تعجب ہے کہ درماں نہ کرو

زندہ دلی

زندہ دل بن کے رہو، تم کو گلستاں کی قسم
رہو ہنس مکھ، تمھیں لالہ و ریحاں کی قسم

دل کے جذبات کا بے ساختہ اظہار کرو
تمھیں آفاق کے مرغانِ خوش الحاں کی قسم

زندگی میں رہو پروانہ پہ آمادہ سدا
تم کو اے زندہ دلو! تختِ سلیماں کی قسم

کرنا ساحل کی خموشی کو نہ زنہار پسند
تم کو لے دوستو! ہنگامۂ طوفاں کی قسم

بحر سے گر تمھیں ملنا ہو تو بے تاب رہو
موجِ رقصاں کی قسم ریلِ شتاباں کی قسم

اپنے قطرے کو بنا کر رہو تابندہ گہر
طور کی تم کو قسم، بارشِ نیساں کی قسم

لن ترانی سے نہ رکنا طلبِ دید سے تم
طور کی تم کو قسم، موسیِٰ عمراں کی قسم

تمھیں پستی سے بلندی پہ پہنچنا ہے ضرور
چاہِ کنعاں کی قسم، یوسفِ کنعاں کی قسم

خودشناسی

ہے مرے جذبات کا ہنگامہ برپا دہر میں
ظالم و جاہل ہوں لیکن رونقِ محفل ہوں میں

رہبری اور گمرہی دونوں ہیں میری ذات میں
ہادیٔ منزل ہوں میں، سرگشتۂ منزل ہوں میں

اہرمن بھی ساتھ یزداں کے مری فطرت میں ہے
روشنیٔ حق ہوں میں، تاریکیٔ باطل ہوں میں

دشت میں کرتا ہے خود ابرِ کرم میری تلاش
ناز ہے مجھکو کہ ایسا تشنہ لب سائل ہوں میں

میری ہستی کے ہے پردہ میں چھپا سورج مگر
اُس دُھندلکے کی حقیقت سے ابھی غافل ہوں میں

فلسفہ نے میری ہستی پر نظر ڈالی مگر
حل نہ ہوگی جو کسی صورت سے وہ مشکل ہوں میں

مجھ پہ کیوں ہوتا ہے طاری جذبۂ ناز و غرور
صانعِ کامل کی شاید صنعتِ کامل ہوں میں

ڈال مجھ پر اک نظر اے نخلبندِ کائنات
تیری کشتِ آرزو کا آخری حاصل ہوں میں

آفتابِ دل

نہ دیکھ دل کو حقارت سے، اگر زراب ہے یہ
جسے تو ذرہ سمجھتا ہے، آفتاب ہے یہ
ہزاروں نغمۂ اسرار اس میں پنہاں ہیں
خدا کے ہاتھ سے بجتا ہے وہ رباب ہے یہ
نئی اُمنگیں اُٹھاتی ہے اس کی ہر جنبش
طلسمِ عالمِ نیرنگیِ شباب ہے یہ
نشہ ہے زندگیِ لازوال کا اس میں
پلا نہ خضر کو، وہ ساغرِ شراب ہے یہ

(کتاب "سلیم" صفحہ ۵)

دعوتِ انقلاب

کیا لے گا خاکِ مُردہ و اُفتادہ بن کے تُو
طوفان بن، کہ ہے تری فطرت میں انقلاب

کیوں ٹمٹماتے کرمکِ شب تاب کی طرح
بن سکتا ہے تو اوجِ فلک پر اگر شہاب

وہ خاک ہو، کہ جس میں ملیں ریزہ ہائے زر
وہ سنگ بن کہ جس سے نکلتے ہیں لعلِ ناب

چڑیوں کی طرح دانہ پہ گرتا ہے کس لئے
پرواز رکھ بلند، کہ تو بن سکے عُقاب

وہ چشمہ بن، کہ جس سے ہوں سرسبز کھیتیاں
رہرو کو تُو فریب نہ دے صُورتِ سراب

("سلیم" صفحہ ۸۱)

خودداری

احسان نہ ہو تجھ پہ، یہ دولت بھی نہیں کم
دولت کے لئے قربِ سلاطیں نہ طلب کر
رہ دل کی اُمنگوں کی نزاکت سے خبردار
ہے جامِ سفالیں تو بلوریں نہ طلب کر
گر سر میں ترے دیدۂ بیدار ہے موجود
سر کے لئے کمخواب کا بالیں نہ طلب کر
دل تیرا جہاں بیں ہے، اُسی دیکھ کے خوش رہ
خسرو کی طرح جامِ جہاں بیں نہ طلب کر

("سلیم" صفحہ ۸۳)

ہنگامۂ اتحاد

عقل کی دیکھی ہے ہم نے فتنہ سامانی بہت
عشق کا ہنگامہ اب کوئی اُٹھانا چاہیئے

ذہن کی فکر آزمائی سے ہے افسردہ بشر
دل کے ارمانوں کا اب جلوہ دکھانا چاہیئے

جذبۂ نسل و وطن کی دیکھ لیں خوں ریزیاں
خاک میں اِن خنجروں کو اب دبانا چاہیئے

ہے بپا دیر و کلیسا کے پرستاروں میں جنگ
حبِّ انسانی کا اب معبد بنانا چاہیئے

("سلیم" صفحہ ۹۹)

شگفتہ مزاجی

رہو یوں خندہ پیشانی کہ تجھے دیکھ کر دُنیا
ہزاروں چاند اُتر آتے ہیں گویا ان جبینوں میں

شگفتہ اُن کے دل رہتے ہیں جو ہنس خلق رہتے ہیں
مسرت کے چمن اُگتے ہیں بس ان گل زمینوں میں

عالمِ اُلفت

جو فلک ہے میری دُنیا پر نشاط افشاں ہے وہ
جو زمیں ہے میری دُنیا میں بہار انگیز ہے

الغرض جس عالمِ اُلفت میں ہے مسکن مرا
کیا جبل کیا دشت، اُس عالم میں جنت خیز ہے

طوطے

پیپل کے ہر درخت پہ طوطوں کے ہیں پرے
چونچیں ہیں لال لال، بدن ہیں ہرے ہرے
چھوٹے پھلوں کو پھینکتے ہیں وہ کتر کتر
منہ سا برس رہا ہے زمیں پر پٹر پٹر

شہتوت

بعض اُودے ہیں مگر بعض ہیں پیلے شہتوت
کیا ہی قدرت نے بنائے ہیں رسیلے شہتوت
لذتِ بادۂ کوثر ہے تو شہتوت میں ہے
شہدِ جنت کا مزا گر ہے تو شہتوت میں ہے

عہدِ شباب

میں ہوں شمعِ محفلِ زندگی، مرا نام عہدِ شباب ہے
مری سانس بادِ بہار ہے، مری چال موجِ شراب ہے
مری عمر کی جو ہیں ساعتیں، ہوئیں عشرتوں میں تمام ہیں
یہی قہقہے یہی چہچہے، مری زندگی کے پیام ہیں

دریا کا کنارہ

یہاں ہوا آزاد ہے، موجیں یہاں آزاد ہیں
سب پرند آزاد ہیں، سب مچھلیاں آزاد ہیں
حسن لیتا ہے یہاں لہریں پڑا چاروں طرف
ہے خوشی چاروں طرف، اور ہے ضیا چاروں طرف

جذبۂ آزادی

اگر آزادیٔ ہندوستاں پنہاں ہے جیلوں میں — تو ہے مشتاق ہر ہندی در و دیوارِ زنداں کا
قتیلِ خنجرِ بیداد کی کرلی زباں بندی — مگر ہے تھامنے والا بھی کوئی چشمِ گریاں کا
کبھی روکے سے رکتا ہے کہیں یہ جذبۂ آزادی — دبانے سے بھڑک اٹھتا ہے شعلہ آہِ سوزاں کا
شہیدانِ وطن کا خون آخر رنگ لائے گا — خدائی کے برابر ہے بہانا خونِ انساں کا

شیکسپیئر

اے شیکسپیئر اے دلِ انساں کے مصوّر — فطرت کے مظاہر ترے دل پر ہوئے ظاہر
وسعت میں تری روح سمندر سے بڑی ہے — رفعت میں نظر تیری ستاروں سے لڑی ہے

ایک تمنّا

ہے مرے دل میں بھی یہ تمنا یونہی رہوں بے نام و نشاں — میں اہلِ جہاں سے دور رہوں، اور مجھ سے رہیں دور اہلِ جہاں
کشمکشِ جذبات سے میرا دامنِ عصمت چاک نہ ہو — پاک رہوں اور پاک ہی جاؤں گھر میں مرے گو خاک نہ ہو

شہتوت

بعض اُودے ہیں مگر بعض ہیں پیلے شہتوت ۔۔۔ کیا ہی قدرت نے بنائے ہیں رسیلے شہتوت
لذتِ بادۂ کوثر ہے تو شہتوت میں ہے ۔۔۔ شہدِ جنت کا مزا گر ہے تو شہتوت میں ہے

عہدِ شباب

میں ہوں شمعِ محفلِ زندگی، مرا نام عہدِ شباب ہے
مری سانس بادِ بہار ہے، مری چال موجِ شراب ہے
مری عمر کی جو ہیں ساعتیں، ہوئیں عشرتوں میں تمام ہیں
یہی قہقہے یہی چہچہے، مری زندگی کے پیام ہیں

دریا کا کنارہ

یہاں ہوا آزاد ہے، موجیں یہاں آزاد ہیں ۔۔۔ سب پرند آزاد ہیں، سب مچھلیاں آزاد ہیں
حُسن لیتا ہے یہاں لہریں پڑا چاروں طرف ۔۔۔ ہے خوشی چاروں طرف، اور ہے ضیا چاروں طرف

جذبۂ آزادی

اگر آزادیٔ ہندوستاں پنہاں ہے جیلوں میں
تو ہے مشتاق ہر ہندی در و دیوارِ زنداں کا

قتیلِ خنجرِ بیداد کی کرلی زباں بندی
مگر ہے تھا منے والا بھی کوئی چشمِ گریاں کا

کبھی روکے سے رکتا ہے کہیں یہ جذبِ آزادی
دبانے سے بھڑک اٹھتا ہے شعلہ آہِ سوزاں کا

شہیدانِ وطن کا خون آخر رنگ لائے گا
خدائی کے برابر ہے بہانا خونِ انساں کا

شیکسپیئر

اے شیکسپیئر اے دلِ انساں کے مصوّر
فطرت کے مظاہر ترے دل پہ ہوئے ظاہر

وسعت میں تری روح سمندر سے بڑی ہے
رفعت میں نظر تیری ستاروں سے لڑی ہے

ایک تمنّا

ہو مرے دل میں بھی یہ تمنا یونہی رہوں بے نام و نشاں
میں اہلِ جہاں سے دور رہوں، اور مجھ سے رہیں اہلِ جہاں

کشمکشِ جذبات سے میرا دامنِ عصمت چاک نہ ہو
پاک رہوں اور پاک ہی جاؤں گھر میں مرے گو خاک نہ ہو

خورشیدِ وحدت

مرے دل کو دکھا کوئی کرشمہ ناگہاں ایسا
کہ ہوش آئے ذرا اس کافرِ معلول و علت کو
بتوں میں چھپ کے بیٹھا تو ہے حسنِ بت شکن تیرا
مگر پہچان لے گا ابنِ آذر تیری صورت کو
گذر جاتا ہے سایہ کی طرح آگے سے یہ عالم
نکلتے دیکھتا ہوں جب ترے خورشیدِ وحدت کو
پڑے گی حسن کی دنیا کے ہر گوشہ میں اک ہلچل
ذرا کروٹ بدلنے دو مرے جذباتِ الفت کو

("سلیم" صفحہ ۱۰۹)

متفرقات

دریا کا سین دیکھیے وقتِ طلوعِ صبح
موجوں سے کھیلتی ہے کرن آفتاب کی

جس سے نکل سکی نہ مری کوئی آرزو
یاد آتی ہے وہ بھول بھلیاں شباب کی

انجام عیش کا ہے خطرناک اے امیرؔ!
تعبیر دوں بتا تجھے مخمل کے خواب کی

یہی ہیں دو ورق، جس میں کتبخانے ہیں دُنیا کے
نہ ہونا نوجوانو! غافل اپنے دیدۂ دِل سے

بہت عمریں کھپائیں تب نظر آتی ہے جھلکی سی
نقابِ چہرۂ اُلفت ذرا اُٹھتا ہے مشکل سے

گنبدِ گرداں میں باقی ہے ابھی تک میری گونج
مٹ گئی جو قوم بنکر اُس کی میں فریاد ہوں،

جس کے پودوں پر نہ چلتی تھی کبھی بادِ خزاں
اُس چمن کی بوئے گُل ہوں خانماں برباد ہوں

وہ نکتے کرتے پیدا، نہ جو سوجھے تھے شاعر کو
کسی شاعر کی پہنچی نظم جب باریک بینوں میں

اُلٹ دیتا نقاب اُس گل کا اُلٹے ہاتھ سے میں بھی
سہارا اگر ترا تھوڑا سا اے بادِ سحر ہوتا

یکایک پو اگر پھٹتی تری صبحِ تجلّی کی
سحر کا رنگ دھندلا صورتِ شمعِ سحر ہوتا

کس لطافت سے یہ مے کھینچتی ہے بادِ سحر — دیکھ شبنم کی جھلک پھول کے پیمانے پر

شمع کو چھیڑ نہ اے موجِ نسیمِ سحری — دل لرزتا ہے مرا شعلہ کے تھرّانے پر

اک بار نورِ صبح کی صافی میں چھان کر — دے مے شفق کے رنگ کی پیرِ مغاں مجھے

پو پھٹتے ہی جو صبحِ ازل سے ہوئی عیاں — تجھ میں دکھائی دیتی ہیں وہ جھلکیاں مجھے

مُلک کا سرمایۂ بقا ہے انھیں سے — قوم کا سامانِ ارتقا ہے انھیں سے

گر ثمرِ شاخِ آرزو ہیں تو یہ ہیں، — جوہرِ شمشیرِ آبرو ہیں تو یہ ہیں،

ہے طبعِ رواں دب کر گھُٹ میں گھُل جاتی — برگد کے تلے آکر ہے گھاس بھی جل جاتی

جو ذہن کہ خلوت میں کرسکتے ہیں ایجادیں — جلوت میں وہ جب پہنچے، سب گرگئیں بنیادیں

اس بہشتِ زندگی سے نوجواں غافل نہ ہوں — عیش کے مشتاق ہیں تو طیش پر مائل نہ ہوں

لذّتِ اخلاقِ شیریں اُن کو چکھنی چاہیے — مَنّ و سلویٰ کی حفاظت اُن کو رکھنی چاہیے

تم اِس چھوٹی سی ہستی کا خوشی سے ناچنا دیکھو — لئے پھرتی ہے تتلی بازوؤں پر اپنے جنت کو

اللہ سے غافل دلِ غمگیں نہ طلب کر — پیشانیِ خنداں کے لئے چیں نہ طلب کر

رنگ اور نور سے دُنیا نظر آتی ہے بھری — بیٹھ کر دیکھ تمناؤں کے طیاروں میں

میں راکھ ہوں اُن انگاروں کی جو سینۂ صحرا میں ہیں دبے

میں لہر ہوں اُن طوفانوں کی جو اُٹھتے ہیں دل کے سمندر میں،

یہ ہے تاروں بھرے افلاک سے اس حُسن کو نسبت

کہ گرد اُس کے رُخِ روشن کے گویا سات ہالے ہیں

نہ اُترا جب وہ اُس کے پیکرِ حُسن و لطافت کا

تصوّر نے مرے کیا کیا صنم سانچوں میں ڈھالے ہیں

کیا عجب کرتے ہوں سجدے ترے جلوے کے حضور دیوتا حُسن کے بستے ہوں اگر تاروں میں

ان ستاروں میں ہوں شاید روشنی کی وادیاں

ناچتی پھرتی ہوں جن میں حُسن کی شہزادیاں

ایک گوشے میں پڑی ہیں تیرے مُلکِ حُسن کے

جنّتیں، جو حور و غلماں کی ہیں نو آبادیاں

تم حُسن کے سورج کو پنہاں نہیں کر سکتے گر چرخِ چہارم تک پردہ کی ہوں دیواریں

ہے تیرے تکبّر کی چھینٹ اُن پہ پڑی شاید مغرور ہیں کیوں یارب! یہ حُسن کی سرکاریں

تیرے جمال کا ہے نگاہوں پہ یہ اثر تاروں پہ ناچتی ہیں ستاروں کی تابشیں

دُنیا کا اندھیرا دیکھ کے ہم شدّت سے پڑے تھے چکّر میں

تاروں سے گئے اب دور نکل لے حُسن تری اک ٹھوکر سے

کیا قدرت ہے کیا عظمت ہے کیا شان ہے کیا شوکت ہے تری

پیشانیاں حور و ملک کی جھکی ہیں اے صنم تیرے مندر میں

بیتی شبیں دہر کے جلووں سے تحیّر میں ہیں غرق — دلنشیں ڈھنگ ہیں قدرت کے معمّاؤں سے

تارے دیتے نہیں کچھ منزلِ مقصد کا پتہ — پار جاتا ہوں میں ان حسن کی دنیاؤں سے

حسن نے کر دیئے پھولوں سے گلستاں پیدا — عشق نے ذرّوں کو ٹکرا دیا صحراؤں سے

نہ ہو گا اے جواں بے محنت و کوشش تونگر تو — ڈبوئے خونِ دل میں گوشۂ دامانِ دولت کو

ایک دن عیش پسندی سے یہ محنت نے کہا — میں غلاموں کو بڑھا دیتی ہوں آقاؤں سے

جب تلاطم عشق کا تھا میں نے اپنے ہاتھ سے — کشتیٔ علم و یقیں کو نذرِ طوفاں کر دیا

سورج کی زد میں گرچہ فنا کا یقین ہے — شبنم کو پھر بھی سینہ سپر دیکھتا ہوں میں

دیکھوں میں تیرا جلوۂ بے رنگ کس طرح — نیرنگیوں کا دل پہ اثر دیکھتا ہوں میں،

کن بتوں کو سجدہ کیا تیرے سامنے — پیشانی اپنی شرم سے تر دیکھتا ہوں میں،

دل سے کسی آفتاب کے اٹھنے کا وقت ہے — رگ رگ میں اپنی نورِ سحر دیکھتا ہوں میں،

بخشی ہیں میرے ذرّہ کو تو نے وہ رفعتیں، — سجدے میں آفتاب کا سر دیکھتا ہوں میں،

دولت کی بستیوں سے بستی تری بعید — اجڑے ہوئے دلوں میں ترا گذر دیکھتا ہوں میں،

ستارے کہکشاں سے ٹوٹ کر کچھ ہو گئے غائب

فرشتے ڈھونڈتے پھرتے ہیں اُن کو مہ جبینوں میں

حُسن کی جو تتلیاں پھرتی ہیں اترائی ہوئی
تیرے جلوؤں سے نظر آتی ہیں دھندلائی ہوئی

ٹوٹ کر گرنے لگے جلوؤں علوے غیب سے
جب نظر آئیں نگاہیں میری للچائی ہوئی

کانپ لئے دل نہ محبت میں تمناؤں سے
ہے گذرنا مجھے ان نور کے دریاؤں سے

رونق جو دیکھتے ہیں تری انجمن میں ہم
وہ عیش کا سماں نہیں پاتے چمن میں ہم

نکلے جو تیری یاد میں گلگشت کے لئے
پہنچے چمن بغل میں دبائے چمن میں ہم

ہیں تیری شمع حُسن پہ پروانہ اس لئے
شعلوں سے کھیلتے ہیں تری انجمن میں ہم

ناکامیوں کا پردہ اُلٹتا ہوں جب کبھی
روئے عروس فتح و ظفر دیکھتا ہوں میں

رکھا ہے ہم نے چادرِ مہتاب جس کا نام
اُڑتی ہی گرد ہے وہ کسی شہسوار کی

وہ لے سلیم! ماہی کوثر سے کم نہیں
رکھتے ہیں جو زبانِ فصاحت دہن میں ہم

دھان کے ہیں کھیت یا نازک حسینوں کے پرے
رنگ کی شادابیاں ہیں حُسن کی سرسائیاں

نگاہوں کو بھی جو تنکے سمجھ کر پھونک دے فوراً
نگاہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں اُس شے کو حسینوں میں

ان شوخ حسینوں کی دل کش سہی رفتاریں
پر زد پہ نہ آ ان کی، بجلی کی ہیں یہ دھاریں

نیا عالمِ تصور

ہر خیالِ کہنہ کو دل سے مٹانا چاہیے — اک نیا عالم تصور کا بسانا چاہیے
لالہ و سوسن کی تصویروں سے دل اُکتا گیا — اک مرقع تازہ رنگوں کا سجانا چاہیے
جام و مینا ہوں نئے، رندانِ میکش ہوں نئے — اک نئے پیرِ مغاں کو ڈھونڈ لانا چاہیے
دیر سے سنتے ہیں سازِ مادیت کی صدا — زمزمہ روحانیت کا اب سنانا چاہیے
جس کی فطرت پاک تر ہو، جس کی سیرت نیک تر — اب وہ انساں عالمِ صورت میں آنا چاہیے

("سلیم" صفحہ ۶۲)

محنت

مزدور کو یہ ایک مبصر نے دی صدا — محنت کے سنگریزوں میں زر دیکھتا ہوں میں
یہ خاکِ مفلسی میں جو ذرے چمکتے ہیں — پوشیدہ ان میں شمس و قمر دیکھتا ہوں میں
محنت بدلنے والی ہے راحت سے بے گماں — خونِ جگر برنگِ دگر دیکھتا ہوں میں

("سلیم" صفحہ ۹۸)